15 اگست کے موقع پر ادارہ المرصاد کی جانب سے

فکری سوغات

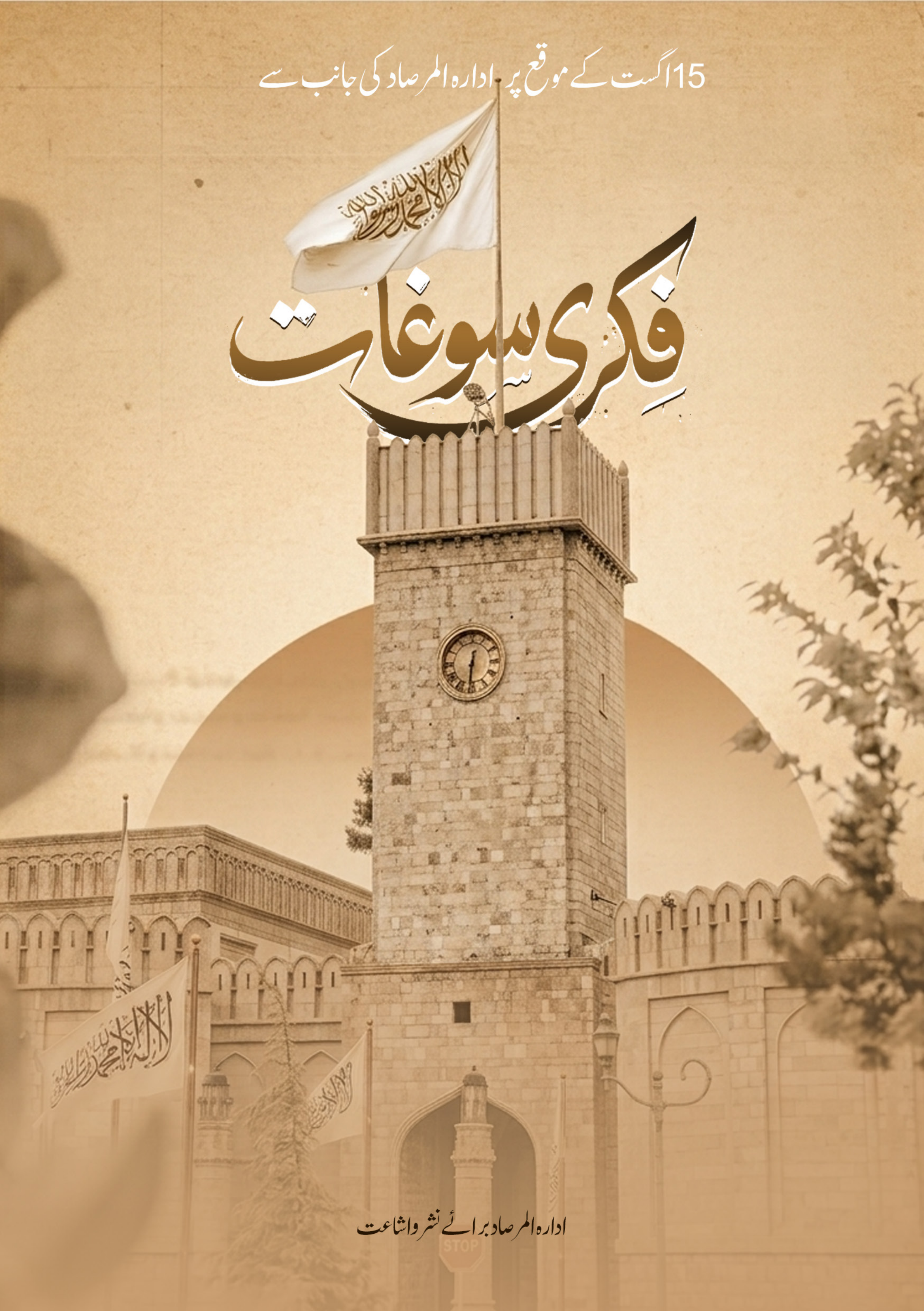

ادارہ المرصاد برائے نشر واشاعت

کتاب کی خصوصیات

کتاب کا نام: 15 اگست کے موقع پر المرصاد کی فکری سوغات

مصنفین: مختلف اہلِ قلم

موضوع: آزادی کی اہمیت، عصرِ حاضر کے خوارج، موجودہ سیاسی صورتِ حال اور اس سے متعلق دیگر موضوعات

زبان: اردو

شمارہ: پانچواں

پیشکش: ادارہ المرصاد برائے نشر واشاعت

ALMERSAAD

فِکری سوغات

یہ کتاب پوری دنیا، بالخصوص اسلامی ممالک میں جاری سیاسی حالات، مسلمانوں کے خلاف عالمی کفر و صلیبی قوتوں کی جانب سے کی جانے والی سازشوں اور مذموم منصوبوں، ممکنہ واقعات، درپیش چیلنجز، باہمی رقابتوں، عصرِ حاضر کے فتنوں، داعشی خوارج اور اسی طرح دیگر نئے باطل افکار اور تحریکوں کے حوالے سے مختلف دینی، تاریخی اور سیاسی تحقیقات، مضامین اور تحریروں کا مجموعہ ہے، جنھیں مختلف اسلامی فکر رکھنے والے اہلِ قلم، جید علمائے دین، تجزیہ نگاروں اور مبصرین نے قلم بند کیا ہے۔

ادارہ المرصاد برائے نشرواشاعت

فہرست

1 اداریہ: پاکستان میں موجودہ بد امنی، فوجی حلقوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے! 1

2 المرصاد کا ہفتہ وار تجزیہ: نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ؛ پاکستان اور داعش کا مشترکہ ہتھیار! 4

3 پہلی فصل: ابطالِ امت 10

4 شہید امیر المؤمنین ملا اختر محمد منصور تقبلہ اللہ کی سوانح حیات، کارناموں اور خوارج کے خلاف موقف کا مختصر جائزہ! 11

5 شہید مجیب الرحمن انصاری رحمہ اللہ کی زندگی اور کارناموں کا مختصر جائزہ! 16

6 شہید الحاج خلیل الرحمن حقانیؒ کی زندگی اور کارناموں پر ایک جامع و مختصر نظر! 22

7 دوسری فصل: ماہ اگست کی ۱۵ تاریخ 30

8 آزادی اور استقلال؛ اسلام کی نظر میں! 31

9 افغانستان میں صلیبی یلغار کے مظالم اور وحشتیں! 37

10 طالبان کی اسلامی تحریک کے آغاز سے ۱۵ اگست ۲۰۲۱ تک 49

11 فتوحات کا جدولِ زمانی 53

12 جمہوریت کا سقوط اور ۱۵ اگست 54

13 امارت اسلامیہ کی حکمرانی کے پانچ سال: کامیابیاں، چیلنجز اور آئندہ کی حکمتِ عملی! 56

14 تیسری فصل: معاصر خوارج 63

15 فتح کے بعد؛ داعش کے خلاف امارتِ اسلامیہ کی کامیاب جدوجہد 64

16 خوارج، کفار کے بجائے مسلمانوں کے قتل کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟ 66

17 صومالیہ میں داعش کا ظہور اور پس منظر! 69

18 ہجرت کا تقدس اور داعش کا ناجائز استعمال! 71

19	چوتھی فصل: دینی اور جہادی تحریریں	73
20	غرناطہ کل، غزہ آج: اسلام کے آخری مورچے کی بقا کی جنگ!	74
21	عزالدین حداد کے لہو کا قرض اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داری	77
22	جہالت اور تکبر کا اتحاد: تہران سے کنڑ تک "علم کشی" کی مشترکہ حکمتِ عملی	79
23	پاکستان کے غیور عوام فوجی طاغوتی رجیم کی غلامی میں!	81
24	اسلام کی نظر میں معصوم عوام کا قتل!	84
25	پانچویں فصل: سیاسی تحریریں	89
26	مکہ دفاعی معاہدہ: تزویراتی حقیقت، کاغذی بازدار قوت اور بدلتے ہوئے علاقائی مہرے!	90
27	پاکستانی فوج کی تزویراتی مصلحت اور تاریخ کے خونی موڑ؛ بلیک ستمبر سے عصرِ حاضر تک	93
28	وہ فوج جس کی اصل دشمنی مسلمانوں سے ہے!	97
29	حالیہ بغاوت گزشتہ سات دہائیوں کے ظلم و جبر کا ردعمل ہے!	101
30	ازبکیوں کے ذریعے قومی تنازعات کو ہوا دینے میں پاکستان کا کردار!	106
31	پاکستان میں سی ٹی ڈی (CTD) کے خلاف سخت مؤقف رکھنے والے جج عبد الحکیم کاکڑ کا داعش کے ہاتھوں قتل: پس پردہ حقائق کیا ہیں؟	109
32	سی آئی اے افغانستان میں کیوں ناکام ہوئی؟ الجزیرہ کی خصوصی رپورٹ	114

اداریہ

پاکستان میں موجودہ بدامنی، فوجی حلقوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے!

گزشتہ دو دہائیوں کے دوران پاکستان میں جاری حملے اور بدامنی ایک طویل اور پیچیدہ سیاسی بحران اور غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں، جن کی جڑیں جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت تک پہنچتی ہیں۔ مشرف نے افغانستان کے خلاف امریکہ کے حملے اور قبضے کی حمایت کی، جس کے نتیجے میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بڑے پیمانے پر ظلم و زیادتی اور انسانی حقوق کی پامالیاں ہوئیں۔ ان علاقوں میں ڈرون حملوں، بمباری اور فوجی کارروائیوں کے باعث ہزاروں قبائلی نوجوان لاپتہ ہوئے یا شہید کر دیے گئے، جبکہ بڑی تعداد میں لوگوں کو زبردستی اپنے گھروں اور علاقوں سے نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔

پاکستان نے امریکہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے خطے کے امن و استحکام کو قربان کر دیا۔ ان پالیسیوں نے نہ صرف خطے کے استحکام کو نقصان پہنچایا بلکہ پاکستان نے ڈالرز کے عوض اپنے ہی خطے میں بدامنی کی بنیاد رکھ دی۔ آج پاکستان میں جاری بدامنی کی بنیادی وجوہ میں یہی غلط اور تباہ کن پالیسیاں شمار ہوتی ہیں۔ ۲۰۲۵ء اور ۲۰۲۶ء میں پاکستان کی داخلی بدامنی کی صورتِ حال غیر معمولی حد تک سنگین ہوئی ہے۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں تحریک طالبان پاکستان اور بلوچ علیحدگی پسندوں کے حالیہ حملے اس کی واضح مثال ہیں، جن میں پاکستانی سکیورٹی فورسز کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

دوسری جانب، اگر پاکستان کا فوجی رجیم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی کارروائیوں میں درجنوں مسلح افراد مارے گئے ہیں، تو بھی یہ حملے ملک کی داخلی کمزوریوں اور سیاسی بحرانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستان کے فوجی حلقے، جو بظاہر ان بدامنیوں کے تسلسل کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں، افغانستان اور پاکستان کے درمیان موجود مسائل کے حل کے لیے معقول اور منطقی راستہ اختیار نہیں کر رہے۔ اس کے بجائے وہ اپنے داخلی مسائل—مثلاً سیاسی جماعتوں کے ساتھ کشمکش، اقتدار پر قبضہ، بعض سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری، معاشی بحران اور بدامنی کو ہوا دینے جیسے معاملات—پر پردہ ڈالنے کے لیے بیرونی عوامل تلاشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی فوج نے مذاکرات کے بجائے جنگ اور دباؤ کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔

اس کے برعکس، امارتِ اسلامیہ نے افغانستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات اور مذاکرات کی صورتِ حال کے حوالے سے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ مسائل کو پُرامن مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے۔ فرضی سرحد (ڈیورنڈ لائن) کے ساتھ امارتِ اسلامیہ کی جانب سے کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں کیا گیا، بلکہ علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان میں علماء کونسل کا اجلاس بلانا بھی شامل ہے، جس کا مقصد علماء کے ذریعے مسائل کے حل کے لیے کوششیں کرنا تھا۔ اسی طرح قبائلی مہاجرین کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے بھی سخت اقدامات کیے گئے، جن میں انہیں فرضی سرحد سے دور کرنا اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی شامل ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان مسائل کے مستقل حل کے لیے امارتِ اسلامیہ ہمیشہ پُرامن راستہ اختیار کرنے اور مذاکرات کے لیے آمادہ رہی ہے، لیکن پاکستانی فریق نے ان کوششوں کو نظرانداز کیا ہے۔ ماضی میں جب پاکستانی جانب سے حملے کیے گئے تو امارتِ اسلامیہ نے ایک مرتبہ جوابی کارروائی کی، تاہم بیشتر مواقع پر مذاکرات کی خاطر جوابی کارروائی سے گریز کیا گیا۔ اکتوبر ۲۰۲۵ء میں پاکستانی حملوں کے بعد قطر، ترکی اور سعودی عرب کی ثالثی سے ایک عارضی جنگ بندی عمل میں آئی، جو خاصی مدت تک برقرار رہی؛ تاہم باہمی مذاکرات پاکستانی فریق کی ہٹ دھرمی کے باعث استنبول اور دوحہ میں ناکام ہو گئے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان چاہتا ہے کہ امارتِ اسلامیہ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کو مکمل طور پر اپنی سرزمین سے نکال دے، حالانکہ امارتِ اسلامیہ نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ اس نے ٹی ٹی پی کو پناہ دے رکھی ہے۔ امارتِ اسلامیہ بارہا سرکاری سطح پر واضح کر چکی ہے کہ وہ کسی کو بھی افغانستان کی سرزمین کسی دوسرے ملک یا فریق کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

اب جبکہ پاکستان نے ایک بار پھر افغانستان میں بے گناہ شہریوں کو نشانہ بنایا ہے، افغانستان کا صبر اور تحمل اپنی آخری حدوں کو پہنچ رہا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ افغانوں نے کبھی اپنے خلاف ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینا فراموش نہیں کیا۔ اگر یہ صورتِ حال اسی طرح جاری رہی تو پاکستانی فوجی حلقوں کو ایک سخت ردِعمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

ان مسائل کے مستقل حل کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان پہلے اپنے داخلی مسائل کو حل کرے اور مذاکرات کی میز پر آئے۔ دونوں ممالک کے درمیان پُرامن تعلقات کا قیام نہ صرف خطے کے استحکام کی ضمانت بن سکتا ہے بلکہ معاشی ترقی اور عوام کی خوشحالی کی راہ بھی ہموار کر سکتا ہے۔ امارتِ اسلامیہ نے ہمیشہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ اچھے

تعلقات اور امن کے قیام کے مقصد سے مذاکرات کے ذریعے مسائل کے حل کی خواہش کا اظہار کیا ہے، جو ایک ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی عکاسی کرتا ہے؛ تاہم مسلسل حملے اور الزامات ان کوششوں کو کمزور کر رہے ہیں۔
پاکستان کو یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے اور جنگ کے بجائے امن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ جنگ کا فائدہ صرف شرپسند عناصر کو پہنچتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ ماضی کی غلط اور تباہ کن پالیسیاں کس طرح آج کی نسلوں کو متاثر کرتی ہیں۔ دونوں ممالک کی قیادت کو چاہیے کہ وہ اپنے عوام کے مفادات کو ترجیح دیں اور پُرامن حل کے لیے سنجیدہ اقدامات اٹھائیں، تاکہ خطے کا مستقبل روشن اور پُرامن ہو سکے۔

المرصاد کا ہفتہ وار تجزیہ

نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ؛ پاکستان اور داعش کا مشترکہ ہتھیار!

نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگیں، جدید دنیا میں مسلح جنگ کے ساتھ ساتھ جنگ کی اہم ترین اقسام میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ جنگیں ذہنوں، احساسات اور ارادوں کے خلاف لڑی جاتی ہیں، اور اکثر ان کے نتائج عسکری حملوں سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ نفسیاتی جنگ وہ جنگ ہے جس میں ہتھیار استعمال نہیں کیے جاتے، لیکن اس کے اثرات مسلح جنگ سے کہیں زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں۔ یہ جنگ انسانوں کے اذہان، احساسات، خوف، امیدوں اور ارادوں کو نشانہ بناتی ہے۔ یعنی یہ ایسی منصوبہ بند کوششیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے مخالف فریق کے سپاہیوں، کمانڈروں، عام لوگوں کا حوصلہ پست، جبکہ اپنے فریق کا حوصلہ بلند کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن زیادہ گولیاں چلائے بغیر ہی شکست تسلیم کرلے، ہتھیار ڈال دے یا اپنا منصوبہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوجائے۔

نفسیاتی جنگ کی کئی اقسام ہیں:

* سفید نفسیاتی جنگ(White Psychological Warfare): اس میں حقیقی معلومات کو خاص انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

*سیاہ نفسیاتی جنگ (Black Psychological Warfare): اس میں دشمن کے بارے میں مکمل جھوٹ اور جعلی خبریں پھیلائی جاتی ہیں۔

* سرمئی نفسیاتی جنگ (Grey Psychological Warfare): اس میں موجودہ حالات کے بارے میں آدھی سچائی اور آدھا جھوٹ پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے ذرائع اور حربے:

اونچی آوازیں، تیز روشنیاں اور موسیقی (نیند سے محروم رکھنے کے لیے)، جعلی خبریں اور ویڈیوز، قیدیوں کے ساتھ مخصوص برتاؤ تاکہ وہ پروپیگنڈا کریں، سوشل میڈیا مہمات، خوف وہراس پھیلانا وغیرہ۔

یہ جنگ مؤثر کیوں ہے؟

کیونکہ انسان کا ذہن ہر چیز سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اگر حوصلہ ٹوٹ جائے تو دنیا کی مضبوط ترین فوج بھی شکست

کھا جاتی ہے۔ ایک ایسا سپاہی جو یہ یقین کر لے کہ "ہم ہار رہے ہیں"، وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی شکست کھا چکا ہوتا ہے۔ آج نفسیاتی جنگ ہر ملک کی قومی دفاعی حکمتِ عملی کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ ممالک کے پاس نفسیاتی آپریشنز کے خصوصی شعبے ہوتے ہیں جو چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔

پروپیگنڈا جنگ:

پروپیگنڈا جنگ وہ جنگ ہے جس میں "حقیقت" پر قبضہ جمانے کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ کون اپنی کہانی غالب کرے گا؟ کون دنیا کو یہ باور کرائے گا کہ "ہم اچھے ہیں اور وہ برے ہیں؟"

یعنی یہ جنگ معلومات اور بیانیوں کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کی رہنمائی کرتی ہے، اپنے حق میں حمایت جمع کرتی ہے اور دشمن کو بدنام کرتی ہے۔ یہ دونوں جنگیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، اور پروپیگنڈا نفسیاتی جنگ کا ایک اہم حصہ ہے۔

پروپیگنڈا (Propaganda) ایک منظم اور منصوبہ بند عمل ہے، جس کے ذریعے میڈیا، فن، تعلیم اور ثقافت کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں پر اثر ڈالا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک مخصوص نظریے کو قبول کر لیں۔ نفسیاتی جنگ کی طرح اس کی بھی سفید، سیاہ اور سرمئی اقسام ہیں۔ سفید پروپیگنڈے میں اپنے فریق کی کامیابیوں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ سیاہ پروپیگنڈے میں مکمل جھوٹ (جعلی تصاویر، جعلی ویڈیوز، جعلی آوازیں وغیرہ) پھیلائے جاتے ہیں، جبکہ سرمئی پروپیگنڈے میں کچھ حقیقت اور زیادہ تر جعل سازی شامل ہوتی ہے۔

پروپیگنڈا جنگ کے جدید ذرائع نہایت خطرناک ہیں اور ہر فریق بہت کم وسائل کے باوجود ان کے ذریعے دشمن کے خلاف مؤثر کارروائی کر سکتا ہے۔ سوشل میڈیا کے الگورتھمز، مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ مواد (تصاویر، ویڈیوز، آوازیں)، سوشل میڈیا کے معروف افراد، میمز اور کارٹون، نیز اسکول اور تعلیمی نصاب (خصوصاً تاریخ کی کتابیں) اس کے اہم ذرائع ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ پروپیگنڈا اتنا طاقتور کیوں ہوتا ہے اور اتنی آسانی سے لوگوں کو کیوں متاثر کر لیتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان "کہانی" سے متاثر ہونے والی مخلوق ہے۔ اگر آپ ایک اچھی کہانی سنا دیں کہ "ہم مظلوم ہیں" یا "ہم ہیرو ہیں"، تو لوگ آپ کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ اکثر حقیقت سے زیادہ اہم یہ ہوتا ہے کہ کہانی کس انداز میں پیش کی جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، آج پروپیگنڈا کے ذرائع انتہائی آسان اور ہر شخص کی دسترس میں ہیں، لیکن اسی نسبت سے

ان کے خطرات بھی کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ لوگوں کے درمیان نفرت یا بد اعتمادی پھیلانا، جھوٹ کو اس قدر عام کر دینا کہ سچ پر یقین نہ رہے، نوجوانوں کو انتہاپسندانہ افکار کی طرف مائل کرنا، اور ایسے ہی بہت سے عوامل ہیں جنہوں نے بوڑھوں، نوجوانوں اور بچوں سب کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ آج پروپیگنڈا جنگ مسلح جنگ سے پہلے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ جو ملک پروپیگنڈا میں کامیاب ہو جائے، وہ بہت سے میدانوں میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

پاکستان کی نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ:

پاکستان کی نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ عموماً آئی ایس پی آر (ISPR) اور آئی ایس آئی (ISI) کے ذریعے مشترکہ طور پر چلائی جاتی ہے۔ یہ دونوں ادارے فوجی اور ریاستی سطح پر بیانیہ سازی اور پروپیگنڈا پر توجہ دیتے ہیں، خصوصاً بھارت، کشمیر اور داخلی معاملات کے حوالے سے۔

پاکستان کے سرکاری میڈیا اور آئی ایس پی آر کا بنیادی کردار یہ ہے کہ آئی ایس پی آر، جو 1949ء سے پاکستان کی فوج کا سرکاری شعبۂ اطلاعات ہے، فوجی کارروائیوں، بیانات اور ویڈیوز کے ذریعے قومی بیانیے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ادارے ٹیلی ویژن، فلموں، سوشل میڈیا (فیس بک، ٹوئٹر/ایکس، انسٹاگرام، ٹک ٹاک) اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ ان کا مقصد فوج کا مثبت تاثر قائم کرنا، دشمن (عموماً بھارت اور حالیہ برسوں میں افغانستان) کو موردِ الزام ٹھہرانا اور اندرونی مخالفت کو کم کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے بوٹ اکاؤنٹس، جعلی اکاؤنٹس اور مربوط مہمات استعمال کی جاتی ہیں، جبکہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں، صحافیوں اور انفلوئنسرز کے ذریعے عالمی رائے عامہ پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔

افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات طویل عرصے سے پیچیدہ اور کشیدہ رہے ہیں۔ پاکستان، بالخصوص اس کے فوجی اور انٹیلی جنس ادارے، افغانستان کے داخلی معاملات میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے عرصۂ دراز سے نفسیاتی اور پروپیگنڈا کارروائیاں کرتے آئے ہیں۔ ان کارروائیوں کو "اسٹریٹیجک ڈیپتھ" پالیسی کا حصہ گردانا جاتا ہے، جس کا مقصد افغانستان میں ایک دوست یا تابع حکومت قائم کرنا اور بھارت کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ جنگ بنیادی طور پر جھوٹی خبروں، بیانیہ سازی، مذہبی اور نسلی جذبات کو ابھارنے اور دشمنی پھیلانے کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔

2021ء کے بعد پاکستان اور افغانستان (امارت اسلامیہ) کے تعلقات ڈرامائی انداز میں خراب ہوئے۔ ابتدا میں پاکستان کو امارت اسلامیہ سے کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا، لیکن بعد میں اس نے تحریک طالبان پاکستان (TTP) کے حوالے سے افغانستان پر اعتراضات شروع کر دیے، جبکہ افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کے بارے میں اپنا موقف

برقرار رکھا۔ پاکستان الزام لگاتا ہے کہ طالبان، ٹی ٹی پی کو افغانستان میں پناہ دیتے ہیں اور وہیں سے پاکستان پر حملے کیے جاتے ہیں۔ انہی الزامات کی بنیاد پر پاکستان نفسیاتی اور پروپیگنڈا کارروائیوں کے ذریعے اپنے مؤقف کو مضبوط کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔

فوج کا سرکاری ترجمان (ISPR) باقاعدگی سے افغانستان پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ وہ ”دہشت گردوں کی حمایت کرتا ہے“، نام نہاد سرحد (ڈیورنڈ لائن) کی حفاظت نہیں کرتا اور ٹی ٹی پی کی پشت پناہی کرتا ہے۔ پاکستان میں ہر حملے کے بعد آئی ایس پی آر جلد ہی یہ بیان جاری کرتا ہے کہ ”حملوں کی منصوبہ بندی افغان سرزمین سے کی گئی“ اور ”امارت اسلامیہ ذمہ دار ہے۔“ ان بیانات کا مقصد داخلی حوصلہ بلند کرنا اور عالمی سطح پر خود کو ”متاثرہ فریق“ کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے۔

2021ء کے بعد پاکستان نے کئی مرتبہ افغانستان میں فضائی حملے کیے (جیسے 2025-2026ء میں ننگرہار، پکتیکا، کنڑ اور خوست میں)۔ ان حملوں کو پاکستانی طالبان اور داعش خراسان کے خلاف کارروائی قرار دیا جاتا ہے، اور پروپیگنڈا میں انہیں ”حق دفاع“ اور ”دہشت گردی کے خلاف آپریشن“ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ پاکستان کے مطالبات تسلیم نہ کیے جانے کے ردِعمل میں اس کا اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہے، جو ”شہری ہلاکتوں“ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پاکستانی میڈیا ان حملوں کو کامیابی قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ کامیابی نہیں بلکہ ایک جنگی جرم ہے، جو فوجی رجیم مختلف علاقوں میں انجام دیتی ہے۔

افغانستان کی فضائی حدود کی اس کھلی خلاف ورزی کے علاوہ میڈیا اور ڈیجیٹل پروپیگنڈا میں بھی فوجی رجیم کی جانب سے بوٹ اکاؤنٹس، ہیش ٹیگز اور جعلی خبروں کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ امارت اسلامیہ کو ”نااہل حکمران“ اور ”دہشت گردوں کا سرپرست“ ثابت کیا جا سکے۔ ٹی ٹی پی اور دیگر مسلح گروہوں کے حملوں کے بعد پاکستان اور اس کے ادارے یہ مہم چلاتے ہیں کہ ”افغانستان دہشت گردی کا مرکز بن چکا ہے“ اور ”امارت اسلامیہ اپنے وعدے پورے کرنے میں ناکام ہے“۔ حالانکہ پاکستان افغانستان کے خلاف ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس نے لاکھوں افغان مہاجرین کو بھی اپنے ملک سے بے دخل کر دیا، جسے اس نے اپنی ”سیکیورٹی ضرورت“ قرار دیا، جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔

اس کے علاوہ پاکستان اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی فورمز پر امارت اسلامیہ پر ”دہشت گردی کے خلاف مؤثر اقدامات نہ کرنے“ کا الزام لگاتا ہے، جبکہ امارت اسلامیہ کے اقتدار میں آنے کے بعد سے اس کی پالیسی اور مؤقف

یہی رہا ہے کہ وہ کسی کو بھی افغانستان کی سرزمین کسی دوسرے ملک کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی، اور اس مقصد کے لیے اس نے ضروری اقدامات بھی کیے ہیں۔

مختصراً یہ ایک کثیر جہتی جنگ ہے، جس میں پاکستان ایک طرف فوجی حملے کرتا ہے، دوسری طرف نفسیاتی جنگ (الزامات اور حوصلہ شکنی) اور پروپیگنڈا (میڈیا) کا محاذ بھی گرم رکھتا ہے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ امارت اسلامیہ ٹی ٹی پی کو قابو میں کرے، حالانکہ یہ بات سب پر واضح ہے کہ ٹی ٹی پی پاکستان کے اندر وجود میں آنے والی تنظیم ہے، وہیں اس کی تربیت ہوئی اور وہیں اس کی سرگرمیاں جاری ہیں، لیکن پاکستانی رجیم کی ہٹ دھرمی کے باعث تعلقات جنگی سطح تک پہنچ چکے ہیں۔

داعش نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ کیسے استعمال کرتی ہے؟

داعش کے پاس دنیا کی سب سے کامیاب اور وحشیانہ پروپیگنڈا مشینری موجود تھی، اور اس کی تیز رفتار کامیابی کا ایک بڑا سبب یہی تھا۔ اس نے نفسیاتی کارروائیوں اور پروپیگنڈے کے ذریعے ہزاروں نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اپنے دشمنوں میں خوف پیدا کیا اور دنیا کے سامنے اپنی مخصوص تصویر قائم کی۔ داعش کا پروپیگنڈا محض "خبریں" نہیں تھا بلکہ براہِ راست ایک نفسیاتی ہتھیار تھا۔

اس مقصد کے لیے اس نے اعلیٰ معیار کی پیشہ ورانہ ویڈیوز تیار کیں، جو ہالی ووڈ کی طرز پر بنائی جاتی تھیں (جیسے "جنگ کے شعلے" جیسی فلمیں)۔ اس کے علاوہ جہادی ترانے، اینیمیشن، میمز اور انفوگرافکس متعدد علاقائی اور عالمی زبانوں میں نشر کیے جاتے تھے۔

داعش اپنی کامیابی کا تاثر قائم کرنے کے لیے اپنے جنگجوؤں کو ہیرو اور مجاہد کے طور پر پیش کرتی، جبکہ اپنے دشمنوں کو "کافر" اور "مرتد" قرار دیتی۔ خوف پھیلانے کے لیے سر قلم کرنے، زندہ جلانے اور پھانسی دینے کی ویڈیوز نشر کرتی، امت مسلمہ کو جوڑنے کے لیے "خلافت" کے مقدس نام سے فائدہ اٹھاتی، اور عدل، امن، خوش حالی اور "حقیقی جہاد" کے میدان کا تصور پیش کر کے مختلف طریقوں سے لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتی۔

داعش ذہنوں کی جنگ بہت مہارت سے لڑتی تھی۔ خوف اور دہشت پھیلانے کے لیے وہ اپنے حملوں (جیسے پیرس، برسلز اور مغربی دنیا کے دیگر شہروں میں) کو نہایت ڈرامائی انداز میں منصوبہ بند کرتی، تاکہ یہ پیغام دیا جا سکے کہ "ہم ہر جگہ موجود ہیں، تم کہیں محفوظ نہیں ہو۔"

اسی طرح نوجوانوں، خصوصاً مغربی ممالک میں رہنے والوں، کو "ہیرو" بننے کا احساس دلاتی تھی، یعنی "تم بھی ہیرو

بن سکتے ہو۔" یہ پیغام اس قدر مؤثر تھا کہ بہت سے نوجوان اس سے متاثر ہوئے اور مغربی ممالک میں متعدد حملے کیے۔
جیسا کہ اس مضمون میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آج کل نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ کے جدید ذرائع انتہائی وسیع ہو چکے ہیں اور ہر شخص کو آسانی سے میسر ہیں، اسی طرح داعش کے پروپیگنڈے کا بنیادی ذریعہ بھی سوشل میڈیا ہے۔ اس کے مختلف پلیٹ فارمز، جیسے فیس بک، ٹیلی گرام، ایکس (سابقہ ٹوئٹر) اور درجنوں دیگر ذرائع پر اس کے سیکڑوں ہزار اکاؤنٹس موجود ہیں۔ (یہ سیکڑوں ہزار افراد نہیں، بلکہ ایک ہی شخص کئی کئی اکاؤنٹس چلاتا ہے) تاکہ وہ اپنا پروپیگنڈا زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکے۔
داعش کی میڈیا کوریج نہایت وسیع ہے۔ وہ صرف ویڈیو اور آڈیو نشریات ہی نہیں کرتی بلکہ اعلیٰ معیار، خوبصورت اور دلکش ڈیزائن کے ساتھ رسائل اور کتابیں بھی شائع کرتی ہے۔ اس کی اعماق نیوز ایجنسی کئی زبانوں میں فوری خبریں نشر کرتی ہے، اور وہ موجودہ جنگ کے سب سے مؤثر ذرائع میں سے ایک یعنی ریڈیو کو بھی ایف ایم اسٹیشنوں کی صورت میں استعمال کرتی ہے۔
سوال یہ ہے کہ وہ اتنی کامیاب کیوں تھی؟ پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نے "خلافت" اور "امت" جیسے مؤثر نعروں کے ذریعے دنیا بھر سے مختلف شعبوں کے ماہر افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا، جنہیں داعش نے ان کی مہارت کے مطابق استعمال کیا، اور اس کے نتائج واضح ہیں۔ دوسری وجہ اس کی تیزی تھی؛ وہ خبریں اور دیگر اشاعتی مواد بہت جلد جاری کرتی تھی، اور بھرتی و ترغیب کے طریقوں سے بھی بخوبی واقف تھی، جس کی بدولت وہ آسانی سے اپنے مخاطبین کو متاثر کر کے اپنے حق میں استعمال کر لیتی تھی۔
اب اگرچہ داعش کی نام نہاد خلافت ختم ہو چکی ہے اور خطے میں اس کی زمینی موجودگی بھی بہت محدود رہ گئی ہے، لیکن اس کی آن لائن خلافت سرگرم ہے۔ مختصراً یہ کہ داعش اپنے فوجی زور کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا اور نفسیاتی جنگ کو بھی یکساں اہمیت دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ذہن فتح ہو جائیں تو زمین بھی فتح ہو جاتی ہے۔ آج یہی طریقہ دیگر جہادی گروہ بھی استعمال کر رہے ہیں۔
ہماری اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ نفسیاتی اور پروپیگنڈا جنگ دراصل "حقیقت" کی جنگ ہے۔ جو فریق بہتر کہانی بیان کرے اور لوگوں کے ذہنوں کو فتح کر لے، وہ بہت سے میدانوں میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ جنگیں صرف فوجی طاقت ہی نہیں بلکہ ذہنی قوت کی بھی متقاضی ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آج معلومات بھی ہتھیاروں کی طرح ایک نہایت خطرناک ہتھیار بن چکی ہیں۔

پہلی فصل

ابطالِ امت

شہید امیر المؤمنین ملا اختر محمد منصور تقبلہ اللہ کی سوانح حیات، کارناموں اور خوارج کے خلاف موقف کا مختصر جائزہ!

عُمری مدرسہ کے باوقار شاگردوں میں، امارت اسلامیہ کے دوسرے نامزد سربراہ، شہید امیر المؤمنین ملا اختر محمد (منصور) تقبلہ اللہ بھی شامل تھے، جنہوں نے عملی طور پر امارت اسلامیہ کی قیادت کے فرائض عالیقدر امیر المؤمنین کے حیات میں شروع کیے اور ان کی وفات کے اعلان کے بعد، امارت اسلامیہ کے اہل حل و عقد کے معتبر افراد، علمائے کرام، جہادی رہنماؤں اور دیگر قومی شخصیات نے انہیں امارت اسلامیہ کے نئے سربراہ کے طور پر منتخب کیا۔ انہوں نے لمحۂ شہادت تک مکمل ایمانداری، متانت اور بہادری کے ساتھ اس عظیم قافلے کی رہنمائی کا بھاری فریضہ ادا کیا۔

درج ذیل سطور میں ان تقبلہ اللہ کی زندگی، کارناموں اور داعشی خوارج کے ساتھ ان کے مقابلے کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے:

ولادت:

شہید ملا اختر محمد منصور تقبلہ اللہ، الحاج محمد جان کے بیٹے، 1347 ہجری شمسی (1968ء) میں صوبہ قندھار کے ضلع میوند کے علاقے بند تیمور میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کا خاندان اپنے علاقے میں ایک متدین اور علم دوست خاندان تھا اور ان کے والد ایک علم نواز شخصیت تھے، اس لیے انہوں نے جناب منصور صاحب کی بہترین تربیت کے لیے ان کا پہلا انتخاب دینی تعلیم کو بنایا۔

تعلیم:

شہید منصور صاحب کو سات سال کی عمر میں اپنے والد کی ہدایت پر اپنے علاقے کے ابتدائی مکتب اور گاؤں کی مسجد میں دینی تعلیم کے شعبے میں شامل کیا گیا۔ چونکہ بچپن سے ہی ان میں ذہانت، فہم و فراست اور بصیرت کی علامات نمایاں تھیں، اس لیے اپنے والد کے علاوہ اساتذہ نے بھی ان کی خصوصی تربیت کی۔

چونکہ ان کا خاندان ہجرت کے دوران بلوچستان کے گردی جنگل کیمپ میں مقیم تھا، اس لیے انہوں نے کچھ عرصہ وہیں اور پھر پنج پای کے علاقے میں دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ کوئٹہ چلے گئے، جہاں انہوں نے کوئٹہ شہر اور بعد میں عبداللہ خان کر اس کے علاقے میں ایک مدرسے میں دینی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں، انہوں نے دینی علوم کی تلاش میں پشاور کا رخ کیا اور وہاں کچاگھڑی اور دیگر علاقوں میں دینی اسباق پڑھے اور ایک موقوف علیہ کا دورہ

پشاور کے جلوزئی کیمپ میں مکمل کیا۔
جب وہ دینی تعلیم میں مصروف تھے، اسی دوران افغانستان کی سیاسی قیادت کمیونسٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور افغان مجاہد عوام نے ان کے خلاف اسلامی بغاوت کا آغاز کر دیا۔

جہاد اور سیاسی جد و جہد:

1978ء میں افغانستان پر سوویت حملہ آوروں کے جارحانہ حملے کے بعد، افغان مجاہد عوام نے ان کے خلاف اسلامی مزاحمت شروع کی۔ جناب منصور صاحب نے، جو اس وقت اٹھارہ سال کے تھے، ایک باصلاحیت اور بہادر نوجوان کے طور پر شعوری طور پر اپنے دین اور وطن کے دفاع کے لیے سوویت حملہ آوروں اور داخلی کمیونسٹوں کے خلاف مسلح جہاد کی راہ اختیار کی۔
وہ سال بھر کبھی دینی اسباق میں مصروف رہتے اور جب سبق ختم ہوتے تو جہادی محاذوں کا رخ کرتے۔ 1985ء میں جہادی سرگرمیوں کے لیے انہوں نے قندھار صوبے کے مشہور جہادی کمانڈر شہید قاری عزیز اللہ کی جبھہ کو اپنا جہادی سنگر منتخب کیا اور ضلع پنجوائی کے علاقے پاشمول میں مشہور جہادی شخصیت الحاج ملا محمد حسن اخوند کی سرپرستی میں جہادی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔
محترم منصور صاحب نے متعدد عسکری کاروائیوں میں فعال حصہ لیا اور ایک بار 1987ء میں قندھار صوبے میں روس کے ایک اسٹریٹجک مرکز پر براہ راست کاروائی کے دوران اس طرح زخمی ہوئے کہ ان کا جسم تیرہ جگہوں پر زخمی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں شفاعطا کی۔ دوسری بار 1997ء کی مئی میں، امارتِ اسلامیہ کی حکمرانی کے دوران مزار شریف کے ہوائی اڈے پر زخمی ہوئے اور اس زخمی حالت میں مخالفین کے ہاتھوں اسیر بھی ہوئے۔

طالبان کی اسلامی تحریک میں شمولیت:

1992ء میں افغانستان میں کمیونسٹ نظام کے خاتمے اور خانہ جنگی کے آغاز کے بعد، جناب منصور صاحب نے اپنے جبھہ کے دیگر مخلص مجاہدین کی طرح ہتھیار رکھ دیے اور اقتدار کے لیے شروع ہونے والی ناجائز جنگ کے تسلسل میں کسی کا ساتھ نہ دیا۔ انہوں نے عام زندگی کو ترجیح دی اور ہر قسم کی تنظیمی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی، جبکہ کچھ علمی اور تربیتی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔
1415 ہجری (1994ء) میں جب امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے طالبان کی اسلامی تحریک کی بنیاد رکھی، ملا اختر محمد منصور صاحب اس وقت پشاور کے جلوزئی کیمپ کے امینیہ مدرسے میں شیخ الحدیث مولوی شہاب

الدین دلاور صاحب اور مشہور مدرس مرحوم سید قریش بابا کے پاس دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور دیگر طالبان بھی ان کے ساتھ تھے۔

جب انہوں نے ریڈیو پر طالبان کی تحریک کے قیام کی خبر سنی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس نئی تحریک کی حقیقت جاننے کے لیے چند افراد کو قندھار بھیجنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کو قندھار روانہ کیا، جنہوں نے اسلامی تحریک کے رہنما اور عہدیداروں سے ملاقات کی اور مکمل اطمینان اور تسلی کے بعد اپنے مدرسے کے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ واقعی طالبان اور مجاہدین کی تحریک ہے۔

اس کے بعد ملا اختر محمد منصور اور ان کے دیگر ساتھی روانہ ہوئے۔ جس رات وہ بولدک پہنچے، طالبان نے تختہ پل کا علاقہ فتح کیا تھا اور قندھار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بولدک میں ملا اختر محمد منصور اور ان کے ساتھی طالبان نے آپس میں ایک اجلاس کیا تاکہ اپنا امیر منتخب کریں۔ مشاورت کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ملا اختر محمد منصور صاحب کو اپنا امیر منتخب کیا اور پھر سب نے ان کی قیادت میں اسلامی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔

امریکی حملے کے خلاف مسلح مزاحمت:

سات اکتوبر 2001ء کو افغانستان پر امریکی حملے کے بعد، محترم منصور صاحب نے حملہ آوروں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ امریکہ کے خلاف ان کے جہاد کا ایک قابل ذکر مرحلہ قندھار کے ہوائی اڈے کے اطراف میں امریکی بمباری کے مقابلے میں مزاحمت اور امریکہ کے پٹھوؤں کے ساتھ براہ راست لڑائیاں ہیں۔ دیگر جہادی کارناموں کے علاوہ، 2003ء اور 2008ء میں صوبہ قندھار صوبے کے مرکزی جیل کو مجاہدین کے ہاتھوں دوبار حیران کن انداز میں توڑا گیا، جس کے نتیجے میں دونوں بار مجموعی طور پر ڈیڑھ ہزار سے زائد اسیر مجاہدین دشمن کی قید سے رہا ہوئے، یہ سب کارنامے منصور صاحب کی سربراہی میں انجام پائے۔

امارتِ اسلامیہ کے منتخب امیر کے طور پر انتخاب:

جب 14 شوال المکرم 1436 ہجری بمطابق 30 جولائی 2015ء کو امارت اسلامیہ کی رہبری شوریٰ نے مرحوم امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا باضابطہ اعلان کیا، تو امارت اسلامیہ کی رہبری شوریٰ کے ارکان، مشائخ اور معزز علمائے کرام پر مشتمل ایک اجلاس ہوا جو اہل حل و عقد کی حیثیت کا حامل تھا۔ محترم منصور صاحب کی موجودگی کے بغیر طویل بحث و مباحثہ، اور مشاورت کے بعد انہیں امارت اسلامیہ کے نئے امیر کے طور پر منتخب کیا گیا اور سب نے یک آواز ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

داعش کے ساتھ مذاکرات کا آغاز:

2015ء میں جب داعش نے ولایت خراسان کے قیام کا اعلان کیا، ملا اختر محمد منصور صاحب نے داعش کے رہنما ابوبکر البغدادی کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں منصور صاحب نے داعش سے مطالبہ کیا کہ وہ افغانستان میں طالبان کی قیادت کو تسلیم کرے اور جہادی صفوں کو متحد رکھے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ جہادی صفوں کی تقسیم مجاہدین کی کامیابیوں کو ختم کردے گی اور کفار کے لیے خوشی کا باعث بنے گی۔

اختلافات کی گہرائی:

اگرچہ منصور صاحب نے کوشش کی کہ داعش کو سمجھایا جائے کہ وہ امت مسلمہ کے درمیان اختلافات اور کفار کی خوشی سے باز آئے، لیکن داعش نے اسے قبول نہ کیا اور افغانستان کے مشرقی صوبوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ کچھ مواقع پر داعش نے طالبان کے خلاف حملے کیے اور بالآخر امارت اسلامیہ نے بھی ان کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

اسلامی امارت کا عسکری ردعمل:

داعش کے اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے منصور صاحب نے خصوصی دستے تشکیل دیے۔ صوبہ ننگرہار میں داعش کے خلاف عسکری آپریشنز شروع کیے اور ان کے مراکز کو تباہ کیا۔ امارت اسلامیہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ داعش جہادی صفوں کو تقسیم کرتی ہے اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرتی ہے۔

داعش کے ارکان کا تسلیم ہونا:

امارت اسلامیہ کے دباؤ کے نتیجے میں، داعش کے کچھ رہنما اور جنگجو داعش سے الگ ہوئے اور دوبارہ امارت اسلامیہ میں شامل ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ امارت اسلامیہ کی قیادت کے ساتھ ہم آہنگی اور داعش کے اصلی گھناؤنے چہرے کی شناخت کی وجہ سے انہوں نے داعش کے ساتھ اپنی بیعت توڑ دی اور ملا اختر محمد منصور تقبلہٗ اللہ کی قیادت کو قبول کیا۔

قیادت کی خصوصیات:

1. اتحاد کے لیے عزم: منصور تقبلہ اللہ نے امارت اسلامیہ کے مختلف کمانڈروں کے درمیان اتحاد کے لیے کوششیں کیں اور مکمل طور پر ایک متحد، منظم اور یکجہتی کی حامل صف تشکیل دی۔
2. امن و جہاد کا توازن: انہوں نے امن مذاکرات کے دروازے کھلے رکھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ حملہ آوروں کے خلاف جہاد کو جاری رکھا۔

3 **خوارج کے خلاف فیصلہ کن موقف:** منصور تقبلہ اللہ نے خوارج کے خلاف سخت موقف اپنایا، جو امارت اسلامیہ کے اصولوں اور امت کے اتحاد کے لیے ایک اہم اقدام تھا۔

شہادت:

بالآخر یہ مخلص اور فداکار مجاہد، جو امارت اسلامیہ کے سربراہ کے طور پر منتخب ہونے کے بعد ابھی ایک سال بھی مکمل نہیں کر سکا تھا، 21 مئی 2016ء کو امریکی ڈرون حملے میں شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوا۔ تقبلہ اللہ۔

شہید مجیب الرحمن انصاری رحمہ اللہ کی زندگی اور کارناموں کا مختصر جائزہ

شہید مولانا مجیب الرحمن انصاری، خواجہ محمد رفیق انصاری کے فرزند اور جلیل القدر عالم و صوفی خواجہ محمد صدیق انصاری کے پوتے تھے۔ آپ ۱۳۶۲ ہجری شمسی میں صوبہ ہرات کے ضلع ہشتم میں گازرگاہ کے علاقے میں ایک معروف علمی و روحانی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نسب پانچویں صدی ہجری کے عظیم عالم و صوفی، پیرِ ہرات خواجہ عبد اللہ انصاری رحمہ اللہ تک پہنچتا ہے، جو اپنے دور میں علم و عرفان کے عظیم پیشوا اور ممتاز شخصیت تھے۔

شہید مولانا مجیب الرحمن انصاری اسی دیندار اور علم دوست خاندان میں پروان چڑھے۔ ان کا خاندان گازرگاہ کے علاقے میں خواجہ عبد اللہ انصاری کے مزار اور جامع مسجد کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ یہ خاندان نہ صرف علم و روحانیت کے اعتبار سے معروف تھا بلکہ سماجی سطح پر بھی اسے نمایاں اثر و رسوخ حاصل تھا۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم:

مولانا انصاری ایک روحانی اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا خاندان مالی اعتبار سے بھی خود کفیل تھا۔ ان کے والد اور چچا تجارت سے وابستہ تھے، اس لیے مولانا انصاری بڑی حد تک دنیاوی معاشی مشاغل اور مالی پریشانیوں سے بے نیاز رہ کر علم و دین کے لیے خود کو وقف کر سکے۔

وہ اپنے عالم و صوفی دادا کی آغوش میں ذکر، تلاوت، تعلیم و تعلم کے ماحول میں پروان چڑھے۔ بچپن ہی سے صبح و شام کے اذکار اور تلاوتِ قرآن ان کا معمول تھا۔ سات برس کی عمر میں ان کے دادا نے انہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دارالحفاظ میں داخل کرایا، جہاں انہوں نے معروف استاد مرحوم حافظ مولوی آقا گل خان سے تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں قرآن کریم حفظ کیا۔

اس کے بعد انہوں نے جامع مسجد اویس قرنی کے امام و خطیب مولانا عبد البصیر سے علمِ تجوید کے نظری و عملی قواعد سیکھے۔ پھر باقاعدہ دینی تعلیم کا آغاز کیا اور ہرات کی غیاثیہ مدرسے میں ابتدائی کتب پڑھیں۔

مدرسے سے منبر تک:

شہید انصاری گہری ذہانت اور غیر معمولی فہم و فراست کے مالک تھے۔ اپنے عالم دادا کے علاوہ انہوں نے ہرات کے متعدد معروف علماء سے بھی علم حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچپن ہی سے بیان و خطابت کی غیر معمولی

صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ وہ نہایت شیریں آواز میں تلاوت کرتے اور انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں گفتگو اور تقریر کرتے تھے۔

۱۳۸۰ ہجری شمسی میں، جب ان کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی، انہیں گازر گاہ میں خواجہ عبد اللہ انصاری رحمہ اللہ کی جامع مسجد کی خطابت کی اہم ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے بہت ہی کم عرصے میں پورے ہرات میں ایک ممتاز اور پُرکشش خطیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی۔ یہاں تک کہ ہر جمعہ ان کا خطاب سننے کے لیے ہزاروں افراد جمع ہونے لگے۔

بعد کے زمانے میں ان کی خطابت کی کشش اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آس پاس کے اضلاع سے بھی لوگ ان کا خطاب سننے کے لیے ہرات آتے تھے۔ لوگ جمعہ کے روز صبح آٹھ یا نو بجے ہی مسجد پہنچ جاتے تاکہ شہید انصاری کی پُراثر اور دل نشیں تقریر سن سکیں۔

۱۳۸۴ ہجری شمسی میں وہ فریضۂ حج کی سعادت کے لیے حجازِ مقدس تشریف لے گئے۔ واپسی کے بعد انہوں نے ہرات کے معروف اساتذہ، مثلاً مولانا محمد غوث ہروی، مولانا گل احمد بادمرغانی اور دیگر علماء سے دینی علوم حاصل کیے۔ بالآخر ۱۳۸۹ ہجری شمسی میں مولانا نجیب احمد خراسانی سے دورۂ حدیث مکمل کیا اور دینی علوم سے فراغت کی دستار اپنے سر پر سجائی۔

فراغت کے بعد بھی انہوں نے مزید دو سال تک گازر گاہ مسجد میں خطابت اور تدریس کی مقدس ذمہ داریاں انجام دیں۔ پھر ۱۳۹۱ ہجری شمسی میں حصولِ علم کے لیے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جہاں جامعہ اسلامیہ میں چھ سال تک دینی علوم کی تحصیل جاری رکھی اور امتیازی حیثیت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے شہر اور مدرسے واپس لوٹ آئے۔

شہید مولانا انصاری کی اصلاحی خدمات اور قابلِ فخر مواقف:

مولانا انصاری محض مسجد کے امام اور مدرس نہیں تھے بلکہ ایک فعال داعی، سماجی مصلح اور معاشرے کے خیر خواہ رہنما بھی تھے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں حاصل وسیع اثر و رسوخ اور عوامی مقبولیت کو دینی شعائر کے احیا، اسلامی ثقافت کے فروغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور معاشرتی اصلاح کے لیے استعمال کیا۔

گازر گاہ ہرات شہر کے شمال مشرق میں پہاڑوں اور ٹیلوں کے دامن میں واقع ایک سیاحتی علاقہ ہے، جہاں متعدد مزارات بھی موجود ہیں۔ امریکی قبضے کے دور میں جب شہروں میں بے حیائی، اختلاط اور بے حجابی کے فروغ کے

لیے منظم کوششیں کی جارہی تھیں، تو ان کے اثرات اس علاقے تک بھی پہنچے۔ بعض نوجوان اور خواتین سیاحت کے نام پر یہاں آتے اور بعض خواتین نامحرم مردوں کے ساتھ بھی نظر آتیں۔ اسی طرح بعض نوجوان شراب سمیت مختلف نشہ آور اشیا کا استعمال بھی کرتے تھے۔

چونکہ اس وقت کا حکمران نظام خود ان برائیوں کے فروغ کے لیے سرگرم تھا، اس لیے اس سے ان کے سدباب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ایسے حالات میں مولانا انصاری نے ایک جمعہ کے خطبے میں اعلان کیا کہ آئندہ اگر پورے علاقے میں کوئی عورت محرم کے بغیر یا کوئی نوجوان نشہ آور اشیا استعمال کرتے ہوئے یا کسی دوسری اخلاقی برائی میں مبتلا نظر آیا تو ہم اسے گرفتار کر کے اپنے دارالافتاء میں پیش کریں گے اور شرعی سزا دیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے گروپ تشکیل دیے، جنہیں مخصوص لباس میں علاقے کے اندر تمام منکرات کی روک تھام کے لیے مامور کیا گیا۔ انہوں نے گازرگاہ اور شہر کے دیگر علاقوں میں بڑے بڑے اشتہاری بورڈ بھی نصب کروائے، جن پر خواتین کو حجاب اور عفت و پاک دامنی اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔

اس اقدام نے اس وقت بڑی ہلچل پیدا کر دی۔ ذرائع ابلاغ نے اس پر بھرپور تبصرے کیے، تاہم مولانا انصاری پورے عزم و جرأت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے اور انہیں عوامی حمایت بھی حاصل تھی، اس لیے حکمران نظام ان کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہ کر سکا۔

مولانا انصاری نے اپنے علاقے کے نوجوانوں کی دینی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ وہ ہمیشہ عالمِ اسلام کے اہم مسائل کے حوالے سے احتجاجی اجتماعات منعقد کرتے اور اپنی آواز بلند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یورپ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی تو انہوں نے عوام کو اعلان کیا کہ اگلے روز اس سلسلے میں ایک اجتماع ہوگا۔ ان کے اعلان پر ہزاروں افراد جمع ہوگئے۔ انہوں نے وہاں ایک پُرجوش خطاب کیا اور اس کے بعد معروف حماسی نظم ''مؤمنین بپاخیزید'' اپنے دل نشیں ترنم میں پیش کی۔ ان کی تقریر اس قدر پُراثر تھی کہ ان کے ہر جملے پر لوگ نعرۂ تکبیر بلند کرتے اور ان کے ایمانی جذبات میں جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا۔

تعلیمی اور دعوتی خدمات:

مولانا انصاری نے اپنے گاؤں میں خواجہ عبد اللہ انصاری کے مزار کے قریب دارالعلوم عالی انصار کے نام سے ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس وقت وہاں تقریباً چار سو رہائشی طلبہ کے علاوہ لگ بھگ دو ہزار افراد تعلیم حاصل کر رہے

اس کے علاوہ انہوں نے دارالایتام انصار، مدرسہ دینی انصار — جس میں مردوں اور خواتین کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں — دارالحفاظ انصار، دارالتالیف اور دارالافتاء جیسے اہم دینی مراکز بھی قائم کیے۔ اسی طرح انہوں نے صدائے انصار کے نام سے ایک ایف ایم ریڈیو بھی قائم کیا، جو دعوتی اور اصلاحی پروگرام نشر کرتا ہے۔

امریکی جارحیت کی مخالفت:

مولانا انصاری پختہ ایمان، مضبوط عقیدے اور آزادی پسند فکر کے حامل تھے۔ وہ امریکی قبضے کے سخت مخالف تھے اور ہمیشہ کھل کر قابض قوتوں اور ان کی کٹھ پتلی حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ اپنی تقاریر میں وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ کٹھ پتلی حکومت میں ملازمت اختیار کرنا ناجائز اور اس سے تنخواہ لینا حرام ہے۔

کٹھ پتلی انتظامیہ کے حکام نے انہیں دباؤ، مالی پیش کشوں اور مختلف حربوں کے ذریعے ان خیالات سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ انہیں مختلف مراعات کی پیش کش کی گئی، مگر انہوں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی اور پوری استقامت کے ساتھ اپنی دینی و ایمانی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

ایک مرتبہ جب امریکہ کا آخری کٹھ پتلی حکمران اشرف غنی ہرات آیا تو ہرات کے والی کے ذریعے مولانا انصاری کو پیغام بھجوایا گیا کہ وہ اشرف غنی سے ملاقات کے لیے آئیں۔ مولانا انصاری نے صاف جواب دیا کہ وہ کسی صورت اس شخص کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ بعد میں اشرف غنی کی جانب سے پیغام بھیجا گیا کہ وہ خود گازرگاہ، یعنی مولانا انصاری کے علاقے میں آئے گا، لیکن مولانا انصاری نے پھر بھی واضح کیا کہ اگر اشرف غنی وہاں آ بھی جائے تو وہ اس سے ملاقات نہیں کریں گے۔

ایک مرتبہ نیٹو افواج کا ایک کمانڈر ہرات آیا اور اس وقت کے ہرات کے والی عبدالقیوم رحیمی سے کہا کہ مولانا انصاری کو ضرور ان باتوں سے روکیں۔ والی نے جواب دیا کہ یہ ہمارے اختیار میں نہیں، کیونکہ انصاری اکیلے نہیں ہیں؛ انہوں نے ہزاروں لوگوں کی اسی فکر پر تربیت کی ہے۔ اگر حکومت نے ان کے خلاف کارروائی کی تو ہرات میں بڑا احتجاج اور بغاوت برپا ہوسکتی ہے، جس کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کٹھ پتلی انتظامیہ مولانا انصاری سے کس قدر تنگ تھی، لیکن ان کے وسیع عوامی اثر و رسوخ کے باعث ان کے خلاف براہِ راست کارروائی کرنے کی جرأت نہیں کرپاتی تھی۔

مولانا انصاری ایک نہایت جرأت مند اور بے باک عالم تھے۔ اپنے اصولوں اور اقدار کے معاملے میں انتہائی حساس تھے اور کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں معلوم ہوا کہ ہرات کے بعض اہلِ تشیع کے مکاتب

میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کی گئی ہے تو انہوں نے نہایت جرأت سے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور خبردار کیا کہ اگر یہ عمل دوبارہ دہرایا گیا تو اس کے خلاف سخت عملی اقدام کیا جائے گا۔ ان کی اس تنبیہ کے بعد یہ عمل دوبارہ پیش نہیں آیا۔

مولانا انصاری امریکی جارحیت کے خلاف مسلح جہاد اور امارتِ اسلامیہ کے قیام کی جد و جہد کے مضبوط حامی تھے۔ جب آخری دور میں اسماعیل خان نے مجاہدین کے خلاف کارروائی کی تو مولانا انصاری نے اس کی سخت مخالفت کی، اس کے پاس ایک وفد بھیجا اور اسے سمجھایا کہ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

اسلامی نظام کی حمایت میں بہادری سے کھڑے ہونا:

جس طرح شہید مولانا انصاری قبضے اور مفسد نظام کے مقابلے میں پوری جرأت کے ساتھ کھڑے رہے اور «کلمة الحق عند سلطان جائر» کے مصداق حق بات کہنے کا عظیم فریضہ انجام دیتے رہے، اسی طرح جب افغانستان میں امارتِ اسلامیہ قائم ہوئی اور اسلامی نظام نافذ ہوا تو انہوں نے نہایت وقار، اخلاص اور بہادری کے ساتھ اسلامی نظام کا دفاع کیا۔

اپنی تقاریر میں انہوں نے اسلامی نظام کی بھرپور حمایت کی اور لوگوں کو اسلامی حکومت کی حمایت کی دعوت دی۔ اسی طرح علماء کے ایک عظیم الشان اجتماع میں انہوں نے امارتِ اسلامیہ کا دفاع اور اس کی حمایت کو دینی فریضہ قرار دیا اور مخالفین کو باغی قرار دیا۔ ان کے اس بے باک موقف نے ایک بار پھر اسلام اور اسلامی نظام کے مخالفین میں ہلچل مچادی اور کئی روز تک ذرائع ابلاغ میں اس پر تبصرے ہوتے رہے۔

جب امارتِ اسلامیہ کے سربراہ، امیر المؤمنین شیخ ہبۃ اللہ اخوندزادہ صاحب، ہرات کے دورے پر تشریف لائے تو مولانا انصاری نے ان سے ملاقات کی۔ امارت کی جانب سے سرکاری عہدہ قبول کرنے کی پیش کش انہوں نے مسترد کر دی اور کہا کہ وہ اپنے منبر اور درس گاہ ہی سے اسلامی نظام کی خدمت کرتے رہیں گے۔

شہادت:

۱۱ سنبلہ ۱۴۰۱ ہجری شمسی، بمطابق ۶ صفر المظفر ۱۴۴۴ ہجری، بروز جمعہ مولانا انصاری کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔

اس روز صبح انہوں نے ہرات شہر میں امارتِ اسلامیہ کے نائب، ملا عبد الغنی برادر آخند، کی شرکت میں منعقد ہونے والی ایک اقتصادی کانفرنس میں شرکت کی اور خطاب بھی کیا۔ اس کے بعد انہوں نے جمعہ کی نماز کے لیے وقت پر پہنچنے کی خاطر کانفرنس سے اجازت لی۔

گھر پہنچ کر انہوں نے جمعہ کا مسنون غسل کیا، سفید لباس زیب تن کیا، دستار باندھی، خوشبو لگائی اور نہایت وقار و متانت کے ساتھ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد کی جانب روانہ ہوئے۔ لیکن مسجد کے قریب تقریباً ساڑھے بارہ بجے ایک خودکش حملہ آور نے ان پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں وہ اٹھارہ دیگر افراد، جن میں بیشتر ان کے محافظ تھے، کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اس حملے کی ذمہ داری داعشی خوارج نے قبول کی۔

مولانا انصاری کی نمازِ جنازہ اگلے روز، ہفتہ کے دن، ہرات کے گازر گاہ علاقے کی عید گاہ میں ادا کی گئی۔ عینی شاہدین کے مطابق ہرات شہر نے اس سے پہلے اتنا بڑا جنازہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لاکھوں افراد نے اشک بار آنکھوں اور دعاؤں کے ساتھ اپنے محبوب عالم اور رہنما کو آخری سفر پر رخصت کیا۔

نمازِ جنازہ ان کے چھوٹے بھائی اور جلیل القدر عالم مولانا فضل الرحمن انصاری نے پڑھائی۔ بعد ازاں ہرات شہر کے علماء نے انہیں شہید مولانا انصاری کا جانشین مقرر کیا اور خواجہ عبد اللہ انصاری کی جامع مسجد کا امام و خطیب بھی منتخب کیا۔

شہید الحاج خلیل الرحمٰن حقانیؒ کی زندگی اور کارناموں پر ایک جامع و مختصر نظر!

تاریخ میں بعض افراد کی موت صرف ایک انسان کے رخصت ہونے کا واقعہ نہیں ہوتیں، بلکہ اپنے عہد کے ایک عظیم تضاد کی علامت بن کر ابھرتی ہیں۔ خلیل الرحمن حقّانی—جو ایک زمانے میں عالمی قوتوں کے تعاقب میں تھے اور جن کے سر پر لاکھوں ڈالر کا انعام رکھا گیا تھا—بالآخر اُن لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے جو دینِ اسلام کی آڑ میں اپنی تلواریں مسلمانوں ہی کے سینوں میں پیوست کرتے ہیں۔ یہ وہ پستی ہے جسے تاریخ غداری کا سیاہ ترین باب قرار دیتی ہے۔

وہ ہاتھ جو مسلمان پر اٹھتا ہے، پہلے اپنے ایمان کی بینائی چھین لیتا ہے، پھر اُمت کے وجود کی رگیں کاٹ ڈالتا ہے۔ داعشی گروہ جو اپنے آپ کو دین سے منسوب کرتے ہیں، اُمت کے ایک زخم پر دوسرا زخم لگا گئے۔ جو کام دشمن کئی دہائیوں کی جنگوں میں نہ کر سکا، انہوں نے ایک لمحے کی گمراہی میں کر ڈالا۔ یہ نہ جہاد تھا، نہ شجاعت؛ بلکہ اُس صراطِ مستقیم سے کھلا انحراف تھا جس میں اللہ عزوجل نے بے گناہ انسان کے قتل کو عظیم ترین گناہ قرار دیا ہے۔ مسلمان مجاہد کا قتل چاہے جس نام یا پرچم کے سائے تلے ہو بدترین خیانت ہے۔

آیئے اب اُن داعشی خوارج کے ہاتھوں شہید ہونے والے اُس بہادر مجاہد اور مردِ میدان کی زندگی کی طرف آتے ہیں، جو آگ اور جنگ کی بھٹیوں سے گزر کر نکلا تھا۔ پیدائش سے لے کر شہادت تک اُس کے باوقار سفر کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔

پیدائش اور تعلیم:

شہید خلیل الرحمن حقّانی، خواجہ محمد کے صاحبزادے اور علی بادشاہ کے پوتے تھے۔ تقریباً انہتر (۶۹) سال قبل پکتیا صوبے کے ضلع گردی سیڑھی کے کاریزگی علاقے کے عوض خیل گاؤں (جو ان کے ننھیال کا گاؤں تھا) میں مرحوم خواجہ محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ نسل کے اعتبار سے وہ پختون، پختونوں میں زدران، اور زدران قبیلے میں میزائی سلطان خیل سے تعلق رکھتے تھے۔

انہوں نے رسمی طور پر نہ کسی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی مدرسے میں باقاعدہ درسِ نظامی پڑھا؛ البتہ غیر رسمی طور پر انہوں نے مہد سے لے کر اپنی لحد تک علم کے حصول کی راہ میں مشقتیں، ہجرتیں اور مسلسل

سفر برداشت کیے۔ بچپن ہی سے انہوں نے جدوجہد، قربانی، صبر اور حوصلے کا دامن تھامے رکھا۔

پانچ برس کی عمر میں اپنی والدہ سے قرآنِ کریم کی تعلیم کا آغاز کیا، اور ابتدائی دینی کتابیں مسجد کے امام صاحب سے پڑھ کر مکمل کیں۔ پھر گردی سیڑھی کے کاریز گی گاؤں کے عوض خیل علاقے میں مولوی محمد عمر سے مزید تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اپنے بڑے بھائی مولوی جلال الدین حقّانی رحمہ اللہ سے تیسرے درجے تک کے دینی اسباق پڑھے، اور بعد ازاں جب وہ ہجرت کر کے پختونخوا پہنچے تو وہاں اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ اسی دوران مجاہدین کے زخموں کے علاج کی غرض سے طبّی شعبے میں مختصر مدت کی تربیت بھی حاصل کی۔ لیکن جیسے ہی وطن پر سوویت قبضے کا آغاز ہوا، انہوں نے اپنا پورا ذہن اور ساری فکر مسلح جہاد اور دشمن کے مقابلے کے لیے وقف کر دی۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کی رسمی تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔

تاہم، انہوں نے زندگی کے ہر شعبے کو تعلیم ہی کی نیت سے دیکھا اور تجربے سے سیکھا۔ انہی تجربات نے انہیں ایسا قومی شعور، عوامی بصیرت اور ملی و سیاسی فہم عطا کی جو کئی اعلیٰ ڈگریوں کے حامل افراد میں بھی کم یاب ہے۔

کتاب «لوی مصلح ستر غازی» کے مصنف کے الفاظ میں: حاجی خلیل نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی تھی، مگر فریقین کے درمیان مہلک دشمنی کے معاملے میں ان کا ذہن سیاسی اور فطری بصیرت سے روشن تھا، اسی لیے افغان–سوویت جنگ کے دوران وہ مخالف اہلکاروں کو طعنے نہیں دیتا تھا، بلکہ کہا کرتا تھا: ”تم بدی کو بھی نہیں سمجھتے!“

حاجی خلیل الرحمن حقانی ملکی زبانوں (پشتو اور دری) میں روانی سے بات چیت کرتا، اردو بول سکتا تھا، اور عربی زبان میں افہام و تفہیم کر سکتا تھا۔

سیاسی جد و جہد اور جہادی پس منظر:

حاجی خلیل الرحمن حقانی کی جہادی روح، جوش، بہادری اور دشمن پر غالب آنے کی صلاحیت، اپنے آباؤ واجداد کے جہادی کارناموں سے ماخوذ ہے اور انہی سے ان کی آبیاری ہوئی۔ ان کے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف پکتیا کے زرمت اور لوگر میں اپنی جانیں نچھاور کیں، سخت لڑائیوں کے بعد انگریزوں کو شکست دی اور سب سے بڑھ کر قربانی کے عہد پر قائم رہے۔ ان جنگوں میں حاصل ہونے والے غنائم بھی ملے تھے، جنہیں ان کے بڑے بھائی مولوی جلال الدین حقانی رحمہ اللہ نے بعد میں سوویت فوجوں کے خلاف جہاد میں استعمال کیا۔

داؤد خان کے تختہ الٹنے کے بعد، جب کچھ کمیونسٹ اہم عہدوں پر فائز ہوئے اور اسلام پسندوں پر مظالم شروع کیے، تو بڑے بھائیوں مولوی جلال الدین حقانی اور حاجی محمد ابراہیم حقانی کی قیادت میں، پکتیا کے علماء، قومی سرداروں اور معززین نے بڑے اجلاس منعقد کیے اور کمیونسٹوں کے خلاف سیاسی و جہادی اقدامات شروع کیے۔
کمیونسٹ عناصر نے بڑے بھائیوں کے قتل کی کوشش کی، مگر یہ ناکام رہی اور چھاپے کے دوران ایک خاص حکمت عملی اور عوام کے تعاون کی بدولت وہ محفوظ علاقے تک منتقل کر دیے گئے۔ ان کا خاندان شمل درہ اور گروبی پہاڑ کی جانب پناہ گزین ہوا، مگر کمیونسٹوں نے وہاں بھی ان کی زندگی مشکل کر دی اور پندرہ روزہ محاصرے کے بعد وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔

الحاج خلیل الرحمن حقانی اپنے خاندان کے ہمراہ پانچ روزہ پیدل سفر کے بعد، سن ۱۳۵۴ ہجری شمسی میں پشتونخوا، شمالی وزیرستان کے داتا خیل علاقے سے میران شاہ تک ہجرت کر گئے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے افراد، خصوصاً مولوی جلال الدین حقانی کے ساتھ مل کر، کمیونسٹوں اور سوویت یونین کے خلاف جہادی محاذوں کو اس شدت سے گرم رکھا کہ دوستوں کے بقول: سب سے سخت جنگ کے وقت بھی حقانی صاحب کی آواز سنائی دیتی تھی۔
امریکہ اور نیٹو کے خلاف بے مثال جہادی جدوجہد کے دوران وہ لشکر کے سربراہ رہے، اور اسی جدوجہد کے دوران ۲۰۰۳ء، ۱۵ دسمبر کو امریکی اور پاکستانی افواج کے مشترکہ آپریشنز میں گرفتار ہوگئے۔ بعد ازاں ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر جنرل مشرف کو قتل کرنے کے لیے بم نصب کیا تھا؛ مگر تقریباً چار سال طویل اذیت ناک قید کے بعد رہا ہوئے، پھر دوسری بار پشاور میں تقریباً ایک ماہ تک قید میں رہے۔

سن ۲۰۰۹ء میں اقوام متحدہ نے انہیں اپنی بلیک لسٹ میں شامل کرنے کی تجویز دی، اور ۹ فروری ۲۰۱۱ء کو امریکی وزارت خزانہ کے حکم نمبر ۱۳۲۲۴ کے تحت انہیں بلیک لسٹ میں شامل کیا گیا اور ان کے سر پر پانچ ملین ڈالر انعام کا اعلان کیا گیا۔ مگر شہید حقانی نے اس کی پرواہ کیے بغیر امریکی جارحیت کے خلاف اپنی جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں، یہاں تک کہ آخرکار امریکہ کا آخری فوجی افغانستان سے نکال دیا گیا۔
حاجی خلیل الرحمن حقانی کی بہادری اور کامیابیوں کی بے شمار داستانیں ان کے محاذ کے ساتھیوں کے دلوں میں زندہ ہیں، جہاں شکست کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

جرگوں اور مذاکرات میں حصہ

شہید حاجی خلیل الرحمن حقانی نے اپنی عوامی بصیرت، قبائلی فہم اور مسائل کے حل میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے اتنی تعلیم اور تجربہ حاصل کیا کہ کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کے برابر بھی نہ پہنچ سکے۔ ان کے نانا ایک قومی سردار تھے، اور ان کے انتقال کے بعد قیادت کی پگڑی ان کے چاچا (گل محمد خان) کے سر پہنائی گئی۔

انہوں نے مصلحِ اعظم، غازی اکبر مولوی جلال الدین حقانی رحمہ اللہ کے ساتھ جرگوں اور مذاکرات میں مستقل شرکت کی اور عوامی و قبائلی اختلافات کے حل میں اپنی تمام توانائیاں صرف کیں۔ وہ نہ صرف صوبہ پکتیا میں قبائلی تنازعات کے حل میں فعال کردار ادا کرتے رہے، بلکہ ملکی مسائل کے حل میں بھی پیش پیش اور متحرک رہے۔

حاجی خلیل الرحمن حقانی نے خانہ جنگیوں کے دوران حقانی صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ مل کر مختلف فریقوں کے درمیان صلح و مصالحت کی ناقابل فراموش کوششیں کیں اور ہر محاذ پر خیر کے بیج بوئے۔ جو بھی جرگوں اور مذاکرات کی بات کرتا ہے، یا اس میدان میں مصلح کے طور پر قدم رکھتا ہے، وہ بلاشبہ شہید خلیل الرحمن حقانی کے کارناموں اور تجربات سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

صفات اور مہارتیں

شہید حاجی خلیل الرحمن حقانی تقویٰ، صبر، تحمل اور بہادری کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں نرم دلی اور سخت گیری کا بے مثال امتزاج دیکھا جاتا تھا۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہمیشہ پرجوش رہتے، اور ان کے الفاظ ہمیشہ صاف اور سیدھے ہوتے۔ عسکری امور میں وہ نہایت تجربہ کار اور پیش پیش رہنے والے رہنما تھے۔

سوویت حملے کے دوران ان کی جنگی مہارت اور دلیری کے بارے میں مصری مصنف و صحافی مصطفیٰ حامد، جس نے اس وقت شہید حقانی کو قریب سے دیکھا، اپنی کتاب »دن °° پر بام «میں لکھتے ہیں:

”خلیل الرحمن حقانی ٹینک کے ذریعے نشانہ لگانے میں بے مثال ماہر اور دشمن کی صف اول توڑنے والا بہادر مجاہد تھا۔ نہ صرف وہ ٹینک چلانے میں مہارت رکھتا تھا بلکہ اس کی تکنیکی تعمیر اور ساخت پر بھی عبور رکھتا تھا۔“

الحاج حقانی دل کے صاف، عاجز اور نیک دل انسان تھے، جو یتیموں اور غریبوں کے مددگار تھے۔ وہ اپنا کھانا دوسروں کے ساتھ بانٹتے، اور ضرورت مندوں کو اگر اپنے پاس رقم نہ ہوتی تو قرض لے کر مدد کرتے۔ انتہائی مہربان، بچوں سے محبت کرنے والے اور ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔

جرگوں اور مذاکرات میں مہارت رکھنے والے اور امن پسند یہ نامور مجاہد، ملک کے مختلف اقوام کے درمیان اتحاد

کے لیے دن رات کوشاں رہے اور جنگوں، دشمنیوں کے شعلوں کو جرگوں کے ذریعے بجھاتے۔

اللہ تعالیٰ نے حاجی خلیل الرحمن حقانی اور ان کے خاندان پر وسیع سینہ، کامل صبر، پختہ عزم اور گہری بصیرت کے ساتھ ایسا بلند ظرف اور بخشش کی صفات عطا فرمائی ہیں کہ ہر کوئی ان کی طرف رشک و احترام کی نظر سے دیکھتا۔ جب حاجی خلیل الرحمن حقانی، حقانی صاحب رحمہ اللہ کی طرح دشمن کے سامنے براہِ راست لڑتے، تو لڑائی کے فوراً بعد وہ دشمن کے لیے رحم اور معافی کی بانہوں کو کھول دیتے اور یقین دلاتے: "تم اب محفوظ ہو۔"

اپنے دشمن فوجیوں کو نہ صرف کپڑے اور پیسے دیتے بلکہ خطرناک علاقوں سے اپنے مجاہدین کے ذریعے نکال کر محفوظ مقامات پر منتقل کرتے، جس کے نتیجے میں بہت سے افراد ان کے اچھے سلوک کے اثر سے اپنی فیملی کے پاس واپس جانے کے بجائے انہیں کے ساتھ ٹھہر جاتے اور سخت لڑائیوں میں بھی ان کے ساتھ شامل رہتے۔

وہ کبھی بھی کسی ذمہ داری کے دوران کسی کو اپنے دروازے سے ناامید نہیں کرتے تھے۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہوتا، اس شخص کے ساتھ ہر قسم کی مدد کرتے، جد وجہد کرتے اور مدد فراہم کرتے۔ زندگی کے آخری ایام میں، اگرچہ وہ مہاجرین کے وزیر تھے، مگر عوام کی خدمت دیوانہ وار کرتے، اپنے دفتر کا دروازہ ہر سطح کے افراد کے لیے کھلا رکھتے اور اس وقت تک گھر نہ جاتے جب تک آخری درخواست پر دستخط نہ کر دیتے۔ حقیقت میں، یہ عوام کا خادم اپنے لوگوں کے درمیان خوش رہتا اور مسائل کے حل سے ہی سکون محسوس کرتا تھا۔

الحاج خلیل الرحمن حقانی کی بہترین صفات یا مہارت میں سے یہ بات سب سے نمایاں تھی کہ وہ نہایت جلد تعلقات قائم کر لیتے تھے، انہیں نبھانا اور مضبوط رکھنا بھی خوب جانتے تھے۔ وہ مخالف فریق کے عسکری اور سیاسی حلقوں میں بھی ایسے روابط قائم کر لیتے تھے کہ دشمن کے اہم منصوبوں کی خبر پہلے ہی پا لیتے اور اس کے مقابلے کے لیے بروقت تیار رہتے۔

امارتِ اسلامیہ کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد، انہوں نے اُس وقت کے قندہار اور موجودہ مزار شریف کے گورنر محترم حاجی وفا کے ساتھ قریبی ہم آہنگی اور بے مثال کوششوں سے یہ کامیابی حاصل کی کہ قندہار سمیت ننگرہار، کنڑ اور کئی دیگر صوبے سابق حکومت کے حکام کے ساتھ منظم رابطوں اور اعتماد سازی کے ذریعے بغیر جنگ و جدال اور خونریزی کے امارتِ اسلامیہ کے سپرد ہو گئے۔ اسی طرح انہوں نے سابق نظام کے اعلیٰ حکام کو مکمل تحفظ کی یقین دہانی کرواتے ہوئے ہر ایک کو اُن کے گھروں تک باعزت پہنچانے کی ذمہ داری بھی خود نبھائی۔

ذمہ داریاں

حاجی خلیل الرحمن حقانی نے اپنی جوانی سے زندگی کے آخری لمحے تک بے شمار ذمہ داریاں سنبھالیں، جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

• ہجرت کے دوران مجاہدین کی تربیتی اور جہادی پروگراموں کی ذمہ داری اور افغان مہاجرین کے مسائل حل کرنے والی کمیٹی کی قیادت۔ اسی طرح ہجرت کے دوران سیاسی مخالفین اور مصلحین کی کونسل کی ذمہ داری بھی ان کے ذمہ تھیں۔

* شہید سلیمان شاہ زغروال گروپ کے عمومی سربراہ۔
* خوست، پکتیا، پکتیکا، غزنی، لوگر اور جلال آباد میں اپنے مجاہدین کی قیادت۔
* خوست اور پکتیا کی فتوحات میں سات تنظیموں کے عسکری سربراہ۔
* ڈاکٹر نجیب اللہ کے دورِ حکومت میں مجاہدین کی اعلیٰ کونسل کے رکن۔
* خانہ جنگی کے دوران مسائل کے حل کے لیے اصلاحی کونسل کے رکن، یہ کونسل اس وقت کی حکومت کے عسکری اور سیاسی امور کی ذمہ دار تھی۔
* صبغت اللہ مجددی سے برہان الدین ربانی تک اقتدار کی منتقلی اور امریکہ کے وزیر دفاع، اس کے وفد کے ساتھ سات تنظیموں کی ملاقات میں اپنی تنظیم کی قیادت۔
* حل وعقد کونسل میں پکتیا کے قبائل کے نمائندے۔
* سوویت قبضے کے خاتمے اور افغان جہاد کی کامیابی کے بعد جہادی رہنماؤں کے درمیان اختلافات ختم کرنے کے لیے امام کعبہ کی سربراہی میں قائم کونسل کے رکن۔
* امارت اسلامیہ کے پہلے دور میں جمہوری گارڈ اور خواجہ رواش ہوائی اڈے کا ذمہ دار اور شمالی محاذ کے مجاہدین کا کمانڈر، جو ثور کی بغاوت کے بعد چودہ سالہ جہاد میں بھی ایک محاذ کی قیادت کر چکے تھے۔
* امریکی جارحیت کے دوران ایک مجاہد گروپ کے کمانڈر اور قبضے کے خاتمے کے بعد کابل کے حکام کے ساتھ امن قائم کرنے، عسکری ساز و سامان کی منتقلی اور خونریزی سے بچاؤ کے لیے روابط قائم کرنے والا۔ اسی طرح انہوں نے وقتاً فوقتاً مرحوم حقانی صاحب رحمہ اللہ کی ذمہ داری سنبھالی، متعدد سیاسی اور عسکری اجلاسوں میں ان کی نمائندگی کی اور امارتِ اسلامیہ کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے ساتھ ساتھ مہاجرین کے امور کے معاون وزیر کے

فرائض انجام دیے۔

سن ۱۴۰۲ھ ش میں، جب پاکستان کی طرف سے ہزاروں افغان مہاجرین جبری طور پر افغانستان واپس ملک بدر کیے گئے، تو انہوں نے ان کے لیے ضروری امور کا انتظام کیا اور انہیں ان کے آبائی علاقوں تک پہنچایا۔ اپنی تین سالہ خدمات کے دوران انہوں نے نہ صرف واپس آنے والے افراد کی مدد کی بلکہ مسائل کے حل کے لیے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، پاکستان اور ایران کا سفر بھی کیا۔

علمی و ثقافتی اقدامات

حاجی خلیل الرحمن حقانی کو کتابوں اور میڈیا سے محبت خاندان سے وراثت میں ملی تھی۔ اگرچہ یہ خاندان زیادہ ثقافتی نہیں تھا، لیکن ثقافت کے پرستار بہت تھے اور جہادی تاریخ کے تحفظ میں سرِ فہرست شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی ثقافتی کوششوں کی بدولت، مرحوم مولوی محمد یونس خالص کی قیادت میں «شہداء حزب اسلامی کی سوانح» تیار کی گئی، اور امریکی حملے میں شہید ہونے والے متعدد مشہور شخصیات کی جدوجہد اور کارناموں کے خاکے مرتب کیے گئے، جو اپنی یادداشتوں اور تحریروں کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے خبریں سننا، سیاسی مباحثے دیکھنا، اخبارات اور رسالے پڑھنا، مصنفین کے ساتھ کتابوں کے اشاعت میں مدد کرنا اور بعض کتب خانوں کو ذاتی مالی امداد سے کتابیں عطا کرنا، ان کی ثقافتی نشوونما، شعور کی بیداری اور مضبوط عزم کا مظہر تھا۔ وہ میڈیا کو اپنی سرگرمیوں کی رپورٹس فراہم کرتے، وقتاً فوقتاً خصوصی انٹرویوز دیتے، اور صوبوں کے دوروں کے دوران نہ صرف صحافیوں کو اپنے ساتھ رکھتے بلکہ ان کے ساتھ محبت کا سلوک کرتے، کھانے کے دوران انہیں اپنے دسترخوان پر مدعو کرتے اور باہمی تبادلہ خیال کرتے۔

ہر دور میں خوارج امت کے زخموں کو تازہ کرنے والے رہے ہیں؛ بظاہر دین کا لباس پہنتے ہیں مگر باطن میں تاریکی ہے۔ یہ لوگ قساوتِ قلبی میں اپنی انتہا پر ہیں اور مسلمانوں کے خون کی ان کے ہاں پانی کی ایک بوند کی مانند قدر نہیں۔ علماء نے فرمایا کہ خوارج کی پہچان یہ ہے کہ وہ حق کے نرم پہلو سے بھاگتے ہیں لیکن مسلمانوں کے خلاف تلوار تیز رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ امت کے جسم میں وہ خنجر گھونپتے ہیں جو دشمن کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور امت کے بہترین قائدین کو قتل کرنے میں شریک رہے ہیں۔

شہادت

آخر کار، اسلامی امت کی یہ عظیم ہستی، جو امریکی بلیک لسٹ میں شامل تھی؛ باایمان مجاہد، وہ مجاہد جس کے سر پر

لاکھوں ڈالر انعام مقرر تھے، جسے کسی نے دو انقلابوں کے دوران کفار کو نہیں بیچا، لیکن اسلام کے سخت دشمن داعشی خوارج نے اپنے آقاوں کے باقی ماندہ کام مکمل کیا۔ سن ۱۴۰۳ ہجری شمسی، ماہِ لندہ کی ۲۱ تاریخ کو، شہید الحاج خلیل الرحمن حقانی وزارت مہاجرین کے دفتر میں دوپہر ڈیڑھ بجے داعشی خودکش حملہ آور کے حملے میں شہید ہو گئے۔ (نحسبہ کذا لک واللہ حسیبہ)

ان کا نمازِ جنازہ ماہ قوس کی ۲۲ تاریخ، جمعرات کے دن، ان کے آبائی وطن میں انتہائی عقیدت سے ادا کیا گیا اور انہیں زرغون روغہ کے نئے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے)

اے اسلام کی عظیم شہید!

تم کامیاب ہو اور کامیابی کے ساتھ راہ عدم ہوئے، تم نے اسلام کی تاریخ میں اپنے وجود کے خون کے ساتھ بہادری اور عظمت کے کارنامے ثبت کیے، اور تم اُس بشارت کا حصہ بنے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ جو شخص خوارج کو مارے یا خوارج کی طرف سے شہید کیا جائے، اس کے لیے شہادت ایک عظیم نعمت ہے جو نصیب والوں کو ملتی ہے۔ تم نے اپنی زندگی دینِ مقدس اسلام کی حفاظت کے لیے وقف کی تھی، اور تم نہ صرف اب، بلکہ پہلے ہی شہید ہو چکے تھے، اور اس بلند مرتبے کے لیے دنیاوی زندگی گزار رہے تھے۔

اے باسعادت شہید! تم اسی شخص کے ہاتھوں شہادت پا گئے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی، کو قرآن کریم کی تلاوت کے دوران شہید کیا اور ان کے خون کو قرآن کے صفحات پر بہایا۔

تم اعلیٰ شہید ہو، ایک ایسے شہید، جس کا مقام بے حد بلند ہے، اے اللہ کی عنایات کے حامل! ہم تمہاری راہ پر گامزن ہیں، تمہارے راستے پر اپنی زندگی اور موت کو قبول کرتے ہیں۔

دوسری فصل

ماہ اگست کی ۱۵ تاریخ

آزادی اور استقلال؛ اسلام کی نظر میں!

سیف الدین

آزادی اور استقلال انسان کی قدیم ترین اور مقدس ترین آرزوؤں میں سے ہیں۔ ہر قوم اور ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کا مالک ہو اور کسی دوسرے کی غلامی، ذلت اور استبداد کے زیرِ سایہ زندگی نہ گزارے۔ تاہم یہ سوال کہ ''حقیقی آزادی کیا ہے؟'' اور ''استقلال کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟'' مختلف تہذیبوں اور مکاتبِ فکر میں مختلف انداز سے زیرِ بحث رہا ہے۔ اسلام اس مسئلے کے لیے ایک جامع، متوازن اور الٰہی تصور پیش کرتا ہے؛ ایسا تصور جو صرف بیرونی استعمار اور ظالم قوتوں کے تسلط سے نجات ہی کا نام نہیں، بلکہ اس سے کہیں وسیع تر، انسان کے باطن، عقیدے اور اجتماعی زندگی کو ہر باطل بندھن سے آزاد کرنے کا بھی نام ہے۔

اس مضمون میں اسلام کی نظر میں آزادی اور استقلال کے مفہوم کا چند اہم بنیادی پہلوؤں کے تحت جائزہ لیا جائے گا:

- عقیدے اور فکر کی آزادی
- شخصی آزادی یا انسانی کرامت
- سیاسی اور ارضی آزادی
- اسلام کی نظر میں آزادی کی حدود

آزادی اور استقلال کے لغوی اور شرعی مفاہیم

عربی زبان میں ''حریت'' کا لفظ ''عبودیت'' یعنی غلامی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے ہاتھوں یرغمال یا اس کی ملکیت نہ ہو۔ ''استقلال'' کا لفظ مادہ ''قَلَّ'' سے ماخوذ ہے، جس کے مفہوم میں خود مختاری، بے نیازی اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا شامل ہے؛ یعنی کوئی قوم یا حکومت کسی دوسری قوت کے دستِ نگر، زیرِ تسلط یا تابعِ فرمان نہ ہو۔

تاہم شرعی اصطلاح میں یہ دونوں تصورات مغربی مادہ پرستانہ فکر کی طرح مطلق نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے مربوط ہیں۔ انسان اس وقت حقیقی آزادی حاصل کرتا ہے جب وہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرے؛ اور کوئی قوم اس وقت حقیقی طور پر خود مختار کہلا سکتی ہے جب وہ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق

چلائے، نہ کہ کسی دوسری قوت کی خواہش اور مرضی کے تابع ہو۔

❶ عقیدے اور فکر کی آزادی

اسلام آزادی کے تصور کا آغاز عقیدے سے کرتا ہے۔ حقیقی اور اصل آزادی یہ ہے کہ انسان مخلوق کی ہر قسم کی غلامی، خوف اور تسلط سے نکل کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ [سورۃ البقرۃ: ۲۵۶]

ترجمہ: دین قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں؛ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایک ایسی مضبوط کڑی کو تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔

اس مبارک آیت میں "طاغوت" کا انکار، یعنی ہر سرکش اور ظالم قوت کو مسترد کرنا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ حقیقی آزادی باطل اور طاغوتی نظاموں اور ظالمانہ تسلط کی غلامی سے نجات کا نام ہے، اور یہ نجات صرف اللہ تعالیٰ کی بے مثال بندگی میں مضمر ہے، نہ کہ غیر ذمہ دارانہ اور مطلق العنان خودسری میں۔

اس حقیقت کی ایک نہایت مؤثر اور تاریخی مثال جلیل القدر صحابی ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ کا وہ تاریخی جواب ہے جو انہوں نے جنگِ قادسیہ کے موقع پر فارس کے سپہ سالار رستم کے سامنے دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم لوگ کس مقصد کے لیے آئے ہو تو انہوں نے فرمایا:

(اللهُ ابتعثنا لنُخرِجَ مَن شاءَ مِن عِبادةِ العِبادِ إلى عِبادةِ اللهِ، ومِن ضِيقِ الدُّنيا إلى سَعتِها، ومِن جَوْرِ الأديانِ إلى عَدلِ الإسلامِ فأرسَلَنا بدينه إلى خَلقِه لندعوهم إليه، فمَن قَبِلَ ذلك قَبِلنا منه ورَجعنا عنه، ومَن أبى قاتلناه حتّى نُفضيَ إلى مَوعودِ اللهِ...) [رواہ الطبری فی التاریخ: 2/401]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم لوگوں میں سے جو چاہے، اسے بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور باطل ادیان کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ چنانچہ اللہ نے ہمیں اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم انہیں اس دین کی دعوت دیں۔ پس جو اسے قبول کرلے، ہم اس کی قبولیت کو قبول کرتے ہیں اور اس سے واپس لوٹ جاتے ہیں، اور جو انکار کرے، ہم اس سے اس وقت تک قتال کرتے ہیں جب تک اللہ کے وعدے تک نہ پہنچ جائیں۔

یہ دوٹوک جواب اسلامی فتوحات اور دعوت کی اصل روح کو واضح کرتا ہے کہ مقصد زمینوں پر قبضہ یا ان کا استعمار نہیں

تھا، بلکہ انسانوں کے دلوں کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر توحیدِ الٰہی کی طرف آزاد کرنا تھا۔ اسی لیے اسلام کی نظر میں کوئی بھی سیاسی یا معاشرتی نظام جو انسان کو کسی دوسرے انسان کا غلام اور مطلق تابع بنادے ــــ خواہ وہ بادشاہت، قوم، جماعت یا کسی اور قوت کے نام پر ہو ــــ حقیقی آزادی کی روح کے منافی اور اس سے متصادم ہے۔

❷ شخصی حریت یا انسانی کرامت

اسلام نے انسان کو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی نسل، رنگ، زبان یا معاشرتی مقام سے ہو، ایک خاص مقام اور عزت عطا کی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ [سورۃ الإسراء: ۷۰]

ترجمہ: اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔

یہی وہ بنیادی اصول تھا جس نے اسلامی تہذیب میں غلامی اور رقیت کے مقابلے میں ایک وسیع اخلاقی اور فقہی نظام تشکیل دیا۔ اسی بنا پر غلاموں کو آزاد کرنا عظیم اجر کا باعث اور متعدد گناہوں کے کفارے کی ایک صورت قرار پایا۔

اس سلسلے میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک قول بھی تاریخی کتب میں ملتا ہے:

(مَتَى اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ أُمَّهَاتُهُمْ أَحْرَارًا؟)، [کتاب الولایۃ علی البلدان]

ترجمہ: تم نے لوگوں کو کب سے اپنا غلام بنالیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا؟

اگرچہ محدثین کے درمیان اس واقعے کی سند کے بارے میں علمی بحث موجود ہے اور اسے ایک مشہور تاریخی قول کے طور پر بیان کرنا چاہیے، نہ کہ ایک مستند صحیح روایت کے طور پر؛ تاہم اس قول کا گہرا مفہوم قرآن و سنت کے عمومی اصولوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور تاریخ میں انسانی کرامت و آزادی کے تصور کو تقویت دینے میں اسے وسیع پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

البتہ اسلام میں عقیدے، فکر یا شخصی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی خواہش اور مزاج کے مطابق جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ ہر قسم کی آزادی شریعت کی حدود سے وابستہ ہے، جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

❸ سیاسی اور ارضی آزادی

اسلام صرف عقیدے اور فرد کی آزادی تک محدود نہیں، بلکہ امت کی خودمختاری اور سرزمین کی سالمیت کو بھی شریعت کے اہم بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے۔ جب کوئی بیرونی جارح قوت کسی اسلامی سرزمین پر حملہ آور ہو تو اس سرزمین کا دفاع اور بیرونی حملہ آور کے خلاف مزاحمت، جسے فقہاء "جہادِ دفع" کہتے ہیں، اس سرزمین کے باشندوں پر فرضِ عین ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾ [سورۃ البقرۃ: ۱۹۳]

ترجمہ: اور ان سے اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔

اسی طرح ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ [سورۃ النساء: ۷۵]

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور بنا دیے گئے ہیں؟

فقہ اسلامی کے ممتاز علماء، مثلاً امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دیگر اہلِ علم نے اس اصول پر زور دیا ہے کہ دفاعی جہاد، یعنی بیرونی حملہ آور کے مقابلے میں سرزمین، عزت اور دین کا تحفظ، دیگر فرض عبادات پر مقدم ہے؛ کیونکہ دین، جان، مال اور سرزمین کے تحفظ کے بغیر دیگر دینی ترجیحات کا عملی نفاذ ممکن نہیں رہتا۔

اسی لیے تاریخِ اسلام ان عظیم مزاحمتی تحریکوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں مسلمانوں نے بیرونی استعمار کے خلاف برپا کیا۔ افغانستان کی تاریخ بھی اس حقیقت کی ایک روشن مثال ہے۔ افغان قوم نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ بیرونی استبداد اور جارحیت کے مقابلے میں اپنی آزادی کا پرچم سربلند رکھا ہے۔ ان کی غیرت و ایمانی کارناموں میں تین مغرور عالمی طاقتوں کے خلاف مسلسل نسلوں کی ناقابلِ شکست جدوجہد ایک عظیم فتح کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس سرزمین کے دلیر رہنماؤں نے انگریزوں اور افغانوں کے درمیان ہونے والی تین تاریخی جنگوں (۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۹ء) میں دین اور وطن کے دفاع کے لیے برطانوی استعمار کے خلاف تاریخ ساز مزاحمت کی، جو بالآخر ۲۸ اسد ۱۲۹۸ ہجری شمسی، بمطابق ۱۸ اگست ۱۹۱۹ء، مکمل سیاسی اور سفارتی استقلال کے شاندار اعلان کی صورت میں ثمر آور ہوئی۔

کچھ عرصے بعد جب کمیونزم کے بلاک نے اس سرزمین پر یلغار کی تو انہی باہمت بزرگوں کے بیٹوں نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی راہ پر چلتے ہوئے دس سالہ جہاد و مزاحمت (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء / ۱۳۵۸ء تا ۱۳۶۷ء) میں بے مثال قربانیاں دیں اور ۲۶ دلو ۱۳۶۷ ہجری شمسی، بمطابق ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء، سوویت اتحاد کی مغرور افواج کو افغانستان سے انخلا پر مجبور کر دیا۔

پھر اس داستان کے آخری اور انتہائی حیرت انگیز باب میں اس سرزمین کے باہمت سپوتوں نے عصرِ حاضر کے

سب سے بڑے فوجی اتحاد اور امریکی استعمار کے خلاف دو دہائیوں (۲۰۰۱ء تا ۲۰۲۱ء) پر محیط ایک تاریخی جد وجہد جاری رکھی۔ ان دو کٹھن دہائیوں میں افغانستان کی امارتِ اسلامیہ نے غیر معمولی ایمانی عزم، بے مثال قربانیوں اور مدبرانہ قیادت کے ساتھ اس جد وجہد کی قیادت کی۔ مجاہدین نے جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی اور طاقت کے بے دریغ استعمال کے مقابلے میں عوام اور مجاہدین کے درمیان ایک مضبوط اتحاد اور منظم سیاسی و عسکری نظم قائم رکھا، اور اپنی بے مثال قربانیوں، تقویٰ اور بے پناہ شجاعت کے ذریعے ایک نئی مثال قائم کی۔

یہ نمایاں فتح اور شاندار کامیابی ۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی، بمطابق ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء، کابل کی دوبارہ فتح اور امریکی قبضے کے مکمل خاتمے پر منتج ہوئی۔

امارتِ اسلامیہ افغانستان اس باوقار دن، یعنی ۲۴ اسد، کو بے مثال فخر، آزادی اور اسلامی خود مختاری کی نئی علامت کے طور پر مناتی ہے۔ اگرچہ ان تینوں تاریخی فتوحات کے حالات و سیاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تاہم یہ عظیم کارنامے تاریخ کی ایک نہ ٹوٹنے والی زنجیر کی تین شاندار کڑیاں ہیں؛ ایک ایسا سنہری تسلسل جو بزرگوں اور آباؤ اجداد سے لے کر موجودہ نسل اور امارتِ اسلامیہ افغانستان تک اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ افغانستان کی غیور قوم نے ہمیشہ استقلال کا پرچم بلند، لہراتا اور سربلند رکھا ہے۔

❹ اسلام کی نظر میں آزادی کی حدود

اسلامی فکر اور مغربی لبرل فکر کے درمیان ایک بنیادی امتیاز آزادی کے تصور میں پایا جاتا ہے۔ اسلام آزادی کے لیے مخصوص حدود مقرر کرتا ہے، جبکہ مغربی تصور میں آزادی کو بعض اوقات فرد کی مطلق خود مختاری کے معنی میں لیا جاتا ہے، جہاں انسان اپنی زندگی، جسم، عقیدے اور اخلاق کے بارے میں ہر وہ کام کر سکتا ہے جسے وہ چاہے، خواہ اس کے نتیجے میں شریعت کی حدود ہی کیوں نہ پامال ہو جائیں۔

اسلام اس تصور کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہے کہ آزادی بے حد و حساب اور بے قید ہو۔ آزادی بھی دوسرے تمام حقوق کی طرح ذمہ داری سے وابستہ ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے، اس لیے اس کی حریت الٰہی شریعت کے دائرے اور ایمانی ذمہ داری سے باہر نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کو اپنی مرضی اور اختیار حاصل ہوتا ہے، اس کے کندھوں پر عدل، امانت داری اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کی بھاری ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اسلام کی نظر میں عدل اور شرعی احکام سے عاری آزادی محض فتنہ ہے، حقیقی آزادی نہیں۔

یہی اصول سیاسی حکمرانی کے میدان میں بھی نافذ ہوتا ہے۔ اسلام میں استقلال صرف یہ نہیں کہ کسی بیرونی حملہ آور کو

سرزمین سے نکال دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ اندرونِ ملک الٰہی عدل کا قیام، شرعی احکام کا نفاذ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، معاشرتی برائیوں اور فساد کی جڑوں کا خاتمہ اور عام مسلمانوں کے شرعی حقوق کا تحفظ بھی حقیقی استقلال کے لازمی اور ناقابلِ تفریق اجزا ہیں۔

قرآن کریم حکمرانوں کو عدل و امانت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ [سورۃ النساء: ۵۸]

ترجمہ: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اسی طرح زمین میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہونے کی صورت میں شریعت کے نفاذ اور اقامتِ نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [سورۃ الحج: ۴۱]

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اسی کے ساتھ معاشرتی امن کے قیام اور فساد کی روک تھام کے بارے میں واضح ہدایت فرمائی:

﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾ [سورۃ القصص: ۷۷]

ترجمہ: اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو؛ بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مکمل استقلال دو باہم مربوط اور ناقابلِ تفریق پہلوؤں پر مشتمل ہے: اول، بیرونی قبضے کی عسکری اور فکری جڑوں کا خاتمہ؛ اور دوم، اندرونِ ملک شرعی حاکمیت، عدل کا قیام، منکرات کا خاتمہ اور طاغوتی قوانین کا استیصال۔ اگر صرف بیرونی حملہ آور رخصت ہو جائے، لیکن اندرونِ ملک شرعی احکام اور الٰہی عدل نافذ نہ ہوں اور طاغوتی قوانین برقرار رہیں تو اسلام کی نظر میں ایسا استقلال ناقص اور اپنے حقیقی و مکمل مفہوم سے محروم سمجھا جائے گا۔

موجودہ دور میں امارتِ اسلامیہ افغانستان اسی متوازن اسلامی استقلال، شرعی حریت اور اس عظیم تاریخی سلسلے کی حقیقی اور واحد نمائندہ ہے؛ کیونکہ اس نظام نے ایک طرف بیس سالہ غیر معمولی مزاحمت کے ذریعے بیرونی قبضے اور نیٹو اتحاد کا خاتمہ کیا، اور دوسری طرف اپنے عزیز وطن میں شریعتِ الٰہی کے نفاذ، قیامِ امن، خاتمۂ فساد اور خود مختار اسلامی حاکمیت کا سنہری پرچم پوری سربلندی کے ساتھ لہرا دیا ہے۔

افغانستان میں صلیبی یلغار کے مظالم اور وحشتیں!

ساجد جلال

تمہید

افغانستان اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک بار پھر بیرونی جارح افواج کی ظالمانہ یلغار کا میدان بن گیا۔ 2001ء کے 11 ستمبر کے واقعے کے بعد مغرور امریکا نے "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے جھوٹے اور بے بنیاد نعرے کی آڑ میں مظلوم افغان قوم کے خلاف بلاجواز فوجی حملہ شروع کر دیا۔ 7 اکتوبر 2001ء کو امریکی حملہ آوروں اور ان کے برطانوی اتحادیوں نے افغان سرزمین پر وحشیانہ فضائی حملوں کا آغاز کیا، جس کے بعد نیٹو کے متعدد رکن ممالک بھی افغانستان میں فوجی کارروائی کا حصہ بن گئے۔

اگرچہ جارح بیرونی قوتوں نے اپنے مذموم مقاصد کو چھپانے کے لیے امن و سلامتی، خواتین کے حقوق اور تعمیرِ نو جیسے جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کیے، لیکن عملاً افغان عوام کے لیے اس بیس سالہ قبضے اور جارحیت کا نتیجہ صرف تباہی، گھروں کی بربادی اور خون ریزی کی صورت میں نکلا۔ جنگ طول پکڑتی گئی، گاؤں اور شہر امریکی قابض افواج اور ان کے مقامی کٹھ پتلیوں کی فوجی کارروائیوں کا میدان بنتے گئے، جس کے نتیجے میں بے گناہ شہری بیرونی افواج کی اندھی فضائی بمباری، وحشیانہ شبانہ کارروائیوں اور قابض فوج کے چھاپوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے۔

امریکا اور اس کے صلیبی اتحادیوں نے افغان سرزمین پر فوجی تسلط اور جارحیت کا تمام بوجھ افغانوں کے کندھوں پر ڈال دیا، جبکہ کابل انتظامیہ کے کٹھ پتلی فوجیوں نے بھی غیروں کے مفادات کے لیے اپنے ہی عوام کے خلاف جارحین کے شانہ بشانہ فوجی کردار ادا کیا۔ مجموعی طور پر افغان عوام کے لیے اس بیس سالہ جنگ کے انسانی نقصانات بے حد سنگین تھے۔ اقوام متحدہ کے امدادی مشن برائے افغانستان (UNAMA) نے جنگ کے دوران شہری ہلاکتوں کے اندراج کے لیے باقاعدہ رپورٹس جاری کیں اور اس جنگ میں فریقِ جارح کی جانب سے ہونے والی خلاف ورزیوں کے شواہد بھی ریکارڈ کیے۔

یہ مضمون تاریخ کے اس سیاہ اور المناک دور کی ان وحشتوں، سانحات اور مصیبتوں کے لیے مختص ہے، جنہیں ہمارے مظلوم مجاہد افغان عوام نے بیس سالہ امریکی قبضے، اس کے صلیبی اتحادیوں اور مقامی کٹھ پتلیوں کے جابرانہ

اور خونیں سایے تلے برداشت کیا۔

❶ افغانستان پر امریکی جارحیت کا آغاز:

11 ستمبر 2001ء کا واقعہ امریکا میں پیش آیا۔ اس واقعے کے بعد امریکی استکباری حکومت نے القاعدہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور طالبان سے القاعدہ کے رہنماؤں کو اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ کسی معتبر دستاویز یا غیر جانب دارانہ تحقیقات کے بغیر اس واقعے کو بہانہ بنایا گیا اور افغانستان پر فوجی حملے کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ امریکی حکمرانوں نے سیاسی اور سفارتی ذرائع اختیار کرنے کے بجائے اپنی استکباری روش، تسلط پسندی اور گہری دشمنی کے باعث منطق اور مذاکرات سے انکار کیا اور افغان سرزمین کے خلاف فوجی طاقت اور جارحانہ مطالبات کا سہارا لیا۔

7 اکتوبر کو امریکی حملہ آوروں اور ان کے صلیبی اتحادیوں نے مظلوم افغان عوام کے مختلف علاقوں پر ظالمانہ فضائی حملوں کا آغاز کیا۔ اگرچہ بیرونی جارحین نے ابتدا میں دعویٰ کیا کہ یہ حملے صرف محدود علاقوں تک ہوں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتہائی بے رحمی کے ساتھ ہمارے گاؤں، گھر اور شہری بنیادی ڈھانچے قابض افواج کے جدید اور مہلک ہتھیاروں کی زد میں آ گئے اور بے گناہ شہری ان حملوں میں شہید ہوئے۔

بعد ازاں صلیبی اتحاد نے افغانستان میں اپنی فوجی موجودگی کو وسعت دی اور افغان عوام پر بیس سالہ خون ریز اور غیر انسانی جنگ مسلط کر دی۔ جو جنگ ابتدا میں مختصر اور تیز رفتار فوجی کارروائی کے طور پر پیش کی گئی تھی، وہ رفتہ رفتہ بیس سالہ طویل جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور افغانستان ایک بار پھر بیرونی جارحین اور ان کے اندرونی کٹھ پتلیوں کی گرم جنگوں کے پیچ آ گیا؛ جس کی سب سے بھاری قیمت عام افغان عوام نے ادا کی۔

❷ فضائی بمباریاں؛ بیرونی قابضین کے آسمان سے اترنے والی وحشت اور موت!

امریکی حملہ آوروں اور ان کے اتحادی نیٹو کے جرائم کی ایک بڑی اور خونیں خصوصیت جدید جنگی طیاروں، بغیر پائلٹ ڈرونز اور بے رحمانہ فضائی بمباری کا وسیع اور وحشیانہ استعمال تھا۔ جارحین اور ان کے مقامی کٹھ پتلی اپنے جرائم کو چھپانے اور ان کا جواز پیش کرنے کے لیے ان کارروائیوں کو جھوٹے طور پر "درست" اور "محدود اہداف" کے خلاف قرار دیتے تھے؛ لیکن افغانستان کے پیچیدہ جغرافیائی اور دیہی ماحول میں غلط اطلاعات، اہداف کے غلط تعین اور انٹیلی جنس کی کوتاہیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ روزانہ بے گناہ افغان شہری، مظلوم دیہاتی، خواتین اور بچے بیرونی طیاروں کی بھاری بمباری میں خاک و خون میں ملتے رہے۔

گرانی کا بے رحمانہ سانحہ؛ فراہ، 2009ء:

مئی 2009ء میں صوبہ فراہ کی بالابلوک ضلع کے گرانی علاقے میں امریکی فضائی حملوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگوں کے جاں بحق ہونے کی اطلاعات سامنے آئیں۔

اس ظالمانہ جرم کے متاثرین کی صحیح تعداد کو چھپانا قابضین کا معمول تھا؛ تاہم حقیقت یہ ہے کہ درجنوں بے گناہ افغان، جن میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل تھے، امریکی طیاروں کے حملوں میں نہایت المناک انداز میں شہید ہوئے۔ کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ سے لے کر بیرونی جارحین تک، سب نے کوشش کی کہ افغان عوام کے اس خونیں زخم کی شدت کو کم کر کے پیش کیا جائے، لیکن یہ واقعہ امریکی قبضے کی تاریخ میں شہریوں کے خلاف ان کے انسانی جرائم کی ایک نہایت بے رحمانہ مثال بن گیا۔

کسی گاؤں پر قابضین کے ایسے حملے کا جابرانہ مفہوم صرف چند گھروں کی تباہی نہیں تھا، بلکہ درجنوں خاندانوں کا اجڑ جانا اور باپ، بیٹے، ماں اور بچوں کو انتہائی دل خراش انداز میں کھو دینا تھا۔ اس عظیم سانحے میں درجنوں افغان خاندانوں نے ایک ہی لمحے میں اپنی پوری جمع پونجی اور اپنے قریبی عزیزوں کو کھو دیا۔

شِنڈنڈ کے وحشت ناک سانحات؛ ہرات:

صوبہ ہرات کے ضلع شِنڈنڈ میں بھی 2008ء کی فضائی بمباری کے حوالے سے شہری ہلاکتوں کی بڑی تعداد کی اطلاعات سامنے آئیں۔ متاثرین کی تعداد کے بارے میں مختلف اعداد و شمار پیش کیے گئے، لیکن بیرونی جارحین اور کابل میں موجود ان کے کٹھ پتلی یہ حقیقت اور افغان شہداء کی حقیقی تعداد پوری طرح مسخ نہ کر سکے۔

ایسے بے رحمانہ واقعات کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ میدانِ جنگ سے دور رہنے والے لوگ بھی موت کے خطرے سے محفوظ نہ تھے۔ ایک دیہاتی کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ رات کے وقت طیارے کی آواز کس گھر کے لیے زندگی اور موت کی آخری خبر ثابت ہوگی۔

3 قندوز کے اسپتال پر مجرمانہ بمباری؛ انسانیت اور طبی غیر جانب داری کی پامالی

3 اکتوبر 2015ء کو امریکی قابض افواج نے قندوز شہر میں "ڈاکٹرز وِدآؤٹ بارڈرز" (MSF) کے اسپتال پر وحشیانہ فضائی حملہ کیا۔ یہ افغانستان کی جنگ کے سب سے مشہور اور دردناک واقعات میں شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹرز وِدآؤٹ بارڈرز کی رپورٹس کے مطابق جارح امریکی طیاروں نے اسپتال کی مرکزی عمارت پر کم از کم ایک گھنٹے تک مسلسل اور بلا روک ٹوک بمباری کی، حالاں کہ وہاں ہنگامی مریض، بے بس زخمی اور طبی عملہ موجود تھا۔

اس وحشیانہ حملے میں 42 بے گناہ انسان جاں بحق ہوئے، جن میں طبی کارکن اور مریض بھی شامل تھے۔
یہ سانحہ اس لیے بھی زیادہ دردناک تھا کہ اسپتال جنگ کے متاثرین کے لیے زندگی بچانے کی سب سے محفوظ جگہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہ مریض جو علاج کے لیے اسپتال پہنچے تھے، خود فضائی حملے کا نشانہ بن گئے۔
جنگی قوانین کے تحت اسپتالوں اور طبی مراکز کو خصوصی تحفظ حاصل ہوتا ہے، لیکن قندوز کے واقعے نے ایک بار پھر دنیا کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ امریکی جارحین نے بے مثال تکبر اور بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنگامی طبی مراکز تک کو نہیں بخشا۔ یوں ان کی وحشیانہ جنگ میں مریضوں اور طبی عملے کا تحفظ بھی خطرے میں پڑ گیا۔ امریکی حکومت نے بعد میں اپنی اس دل دہلا دینے والی بے رحمی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس واضح انسانی جرم کو محض "غلطی" قرار دیا، لیکن متاثرہ خاندانوں کے لیے "غلطی" کا ایک لفظ بھی ان کے پیاروں کو واپس زندہ نہیں کر سکتا تھا۔

4 راتوں کو چھاپے اور وحشتیں؛ جب مظلوم افغانوں کے گھر، غیر ملکی افواج کے مظالم کا میدان بن گئے:

بیس سالہ امریکی قبضے کی ایک نہایت بے رحمانہ اور افغان ثقافت و عزت کے منافی کارروائی شبانہ چھاپے تھے۔ جارح امریکی افواج اور ان کے مقامی کٹھ پتلی و دست نگر دستے جھوٹی، بدنیتی پر مبنی اور تعصب سے بھرپور خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر رات کے وقت افغانوں کے گھروں پر چھاپے مارتے تھے۔
افغانستان کے بہت سے دیہات میں رات کے وقت دروازے پر دستک یا ہیلی کاپٹر کی آواز لوگوں کے لیے خوف، غم اور شہادت کا پیغام بن چکی تھی۔

رات کے چھاپے کی ایک عام تصویر:

تصور کیجیے کہ ایک خاندان رات کے وقت اپنے گھر میں سو رہا ہے۔ بچے، خواتین اور بزرگ گھر میں موجود ہیں۔ اچانک ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دیتی ہے، پورا علاقہ گھیر لیا جاتا ہے، بم سے گھر کا دروازہ اڑا دیا جاتا ہے اور بیرونی و مقامی کٹھ پتلی مسلح اہلکار گھروں کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ گھر کے مردوں کو ذلیل کر کے باندھ دیا جاتا ہے، خواتین اور بچوں کی چیخ و پکار آسمان تک پہنچتی ہے، پھر محض ذاتی بدگمانی اور بے بنیاد اطلاعات کی بنیاد پر خالی کمروں کی تلاشی لی جاتی ہے اور گھر کے چند افراد کو قیدی بنا کر لے جایا جاتا ہے؛ تو تصور کیجیے کہ یہ کس قدر ہولناک صورتِ حال ہو گی۔
انسانی حقوق کی تنظیموں نے اپنی درجنوں مستند رپورٹس میں اس امر کی تصدیق کی کہ قابض افواج اور ان کے زیرو ون، زیرو ٹو جیسے جارح اور دست نگر دستوں نے بغیر کسی عدالتی کارروائی کے سیکڑوں بے گناہ افغانوں اور مظلوم دیہاتیوں کو ان کے گھروں میں، ان کے اہل خانہ کے سامنے، نہایت بے رحمی سے گولیاں ماریں؛ بعض کو جبری

طور پر لاپتا کیا اور بعض کو قید کر لیا۔

افغان ثقافت میں گھر انسان کی عزت اور نجی حریم کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے رات کے وقت گھروں میں داخل ہونا اور خواتین و بچوں کو خوف زدہ کرنا بہت سے افغانوں کے لیے محض فوجی تجاوز نہیں بلکہ ناقابلِ معافی طور پر گھریلو حریم کی پامالی اور ایک سنگین جرم بھی سمجھا جاتا تھا۔

5 جیلیں، تشدد اور انسانی وقار کی پامالی:

بیس سالہ قبضے کے دوران بے شمار افغانوں کو بیرونی جارحین اور ان کی وطن فروش خفیہ ایجنسیوں نے بے بنیاد شبہات اور جھوٹے الزامات کی بنیاد پر گرفتار کیا اور انسانیت سوز عقوبت خانوں میں ڈال دیا۔ بعض کو بگرام کے ظالمانہ حراستی مرکز میں رکھا گیا، جبکہ درجنوں دیگر کو افغانستان سے باہر صلیبی قوتوں کے خفیہ اور مخفی عقوبت خانوں میں منتقل کیا گیا۔

بگرام کی بدنام اور جہنم نما جیل:

بگرام کا بڑا فضائی اڈہ قبضے کے دوران امریکی قابض افواج کے ظلم، تشدد اور اذیت رسانی کا سب سے نمایاں مرکز تھا۔ اگرچہ بیرونی افواج اور کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ اس جیل کے حقائق چھپانے کی کوشش کرتی رہیں، لیکن وہاں سے باہر آنے والی معلومات نے ثابت کیا کہ بگرام میں قیدیوں کے ساتھ ایسے وحشیانہ، توہین آمیز اور انتہائی سفاکانہ طریقے اختیار کیے جاتے تھے جن کی انسانی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

قیدی کا درد صرف جیل کی چار دیواری اور امریکی کوڑوں تک محدود نہیں تھا؛ بلکہ اس کا خاندان بھی بے خبری اور غم کے ایک ذہنی قید خانے میں جلتا رہتا تھا۔

ماں کو معلوم نہ ہوتا کہ اس کا بیٹا کہاں ہے، بیوی کو خبر نہ ہوتی کہ اس کا شوہر زندہ بھی ہے یا امریکی جلادوں نے تشدد کر کے اسے قتل کر دیا، اور بچے اپنے باپ کی واپسی کے انتظار میں رہتے تھے۔

افغانوں کی گوانتاناموں منتقلی:

جنگ کے ابتدائی برسوں میں بعض افغانوں کو بدنام اور خوف ناک گوانتانامو بے حراستی مرکز (Guantana-mo Bay detention camp) بھی منتقل کیا گیا۔ یہ جیل ایک طویل عرصے تک دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں کی تنقید کا موضوع بنی رہی، کیونکہ بعض قیدیوں کو طویل مدت تک باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بغیر حراست میں رکھا گیا۔

قانون کی رو سے ہر انسان کو منصفانہ مقدمے کا حق حاصل ہے، لیکن جنگ کے اس ماحول میں بہت سے افغان ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوئے جہاں ان کے مقدمات کے انجام کے بارے میں برسوں گزر جاتے تھے۔

❻ بچوں کا قتل اور ایک نسل کے زخم:

جنگ بچے اور بالغ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔ جب بم کسی گھر کی چھت پر گرتا ہے تو وہ بچے سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم جنگ کا حصہ نہیں ہو۔

افغانستان کی جنگ کے دوران بچے فضائی حملوں، زمینی لڑائیوں، دھماکوں اور نقل مکانی کا شکار ہوئے۔ ہزاروں بچوں نے اپنے والدین میں سے ایک یا دونوں کو کھو دیا۔

جب ایک کم سن بچہ امریکی ہیلی کاپٹروں اور بمباری کی گونج سے نیند سے چونک کر اٹھتا ہے، اپنے صحن کی مٹی اور اپنے شہید ماں باپ کا خون دیکھتا ہے، تو اس کی باقی زندگی بیرونی افواج کی مسلط کردہ جنگ کے باعث ایک دائمی سوگ اور اذیت میں بدل جاتی ہے۔

کچھ بچے یتیم ہوگئے، کچھ زخمی ہوئے اور بعض عمر بھر کے لیے جسمانی معذوری کا شکار ہوگئے۔ اس مسلط کردہ جنگ نے ایک پوری نسل کو صرف مادی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی زخمی کیا۔ وہ بچے جنہیں کتاب، اسکول اور کھیل کی دنیا سے آشنا ہونا چاہیے تھا، ٹینک، طیارے، دھماکے اور موت جیسے الفاظ سے آشنا ہوگئے۔

❼ افغان خواتین کا دل دہلا دینے والا درد؛ غیر ملکی قبضے کی سب سے پوشیدہ اور بھاری قربانی:

مغربی جارح حکومتوں نے اپنی بے بنیاد فوجی یلغار اور امریکی قبضے کا جواز پیش کرنے کے لیے ان بیس برسوں میں "خواتین کے حقوق" کے مکّارانہ اور جھوٹے نعرے بلند کیے؛ لیکن عملاً بیرونی افواج اور ان کے کٹھ پتلیوں کی خونیں کارروائیوں کا سب سے بڑا اور دردناک بوجھ خود مظلوم افغان خواتین نے برداشت کیا۔

جب کوئی گھر فضائی حملے یا جنگ کا شکار ہوتا ہے تو عورت کی زندگی کئی گنا زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے شوہر، بیٹے یا باپ کو کھو دیتی ہے تو بچوں کی پرورش، گھر کے معاشی مسائل اور بے سرپرستی کا تمام بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑتا ہے۔

بہت سے خاندانوں میں جنگ کے باعث خواتین بیوہ ہوئیں اور بچے بے باپ ہوگئے۔ بعض خواتین اپنے گھروں سے بے گھر ہوئیں اور ہجرت و غربت کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئیں۔

اسی لیے قابضین کی جانب سے "خواتین کی آزادی" کے نام پر کیے جانے والے تمام سیاسی دعووں کو ان بے شمار

بیوہ عورتوں اور مظلوم ماؤں کی آہوں، آنسوؤں اور خون کی گہرائی میں پرکھا جانا چاہیے، جنھوں نے بیرونی جارح افواج کے ہتھیاروں کے باعث اپنی خوش حال زندگی اور اپنے خاندانوں کو کھودیا۔

8 دیہات، گھروں اور عام زندگی کی تباہی:

افغانستان ایک بڑی حد تک دیہی ملک ہے۔ جب جنگ کسی گاؤں میں داخل ہوتی ہے تو صرف کوئی فوجی مرکز تباہ نہیں ہوتا، بلکہ لوگوں کی پوری زندگی کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔

ہلمند، قندھار، فراہ، کنڑ، ننگرہار، پکتیا، پکتیکا اور دیگر صوبوں میں جنگ اور فوجی کارروائیوں کے باعث بہت سے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

ایک کسان جب اپنا گھر چھوڑتا ہے تو وہ صرف اینٹوں سے بنی عمارت نہیں چھوڑتا؛ وہ اپنی زمین، فصل، مویشی اور برسوں کی محنت چھوڑتا ہے۔

ایک دکاندار اپنا بازار کھودیتا ہے۔ ایک بچہ اپنا اسکول چھوڑدیتا ہے۔ ایک ماں اپنے گھر کا امن وسکون کھودیتی ہے۔

یوں بیس سالہ ظالمانہ امریکی قبضے کے نتیجے میں مظلوم افغان وطن کی سماجی اور معاشی بنیادیں بری طرح متاثر ہوئیں اور ملک کو بہت بڑا اور تاریخی نقصان پہنچا۔

9 جبری نقل مکانی؛ قبضے کے باعث افغانوں کا اپنے گھروں سے بے دخل ہونا:

امریکی قبضے اور اس کے مقامی کٹھ پتلیوں کی خونیں کارروائیوں کے باعث لاکھوں افغان ملک کے اندر اور بیرونِ ملک ہجرت اور غربت کا شکار ہوئے۔

جبری نقل مکانی محض کسی جغرافیائی مقام کو چھوڑ دینے کا نام نہیں، بلکہ بیرونی جارحین کی بمباری اور مظالم کے باعث ایک افغان اپنی برادری، رشتہ داروں، مسجد، اسکول، بازار اور اس پورے ماحول سے جدا ہوجاتا ہے جہاں اس نے برسوں زندگی گزاری ہوتی ہے۔

بے گھر خاندان کا درد

تصور کیجیے ایک خاندان جنگ کے باعث رات کی تاریکی میں اپنا گھر چھوڑ رہا ہے۔ اپنے ساتھ صرف چند کپڑے، ایک بچہ اور تھوڑا سا کھانا لے کر نکلتا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنا گھر دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔

بے گھر لوگوں کی زندگی میں رہائش، خوراک، صاف پانی، روزگار، تعلیم اور حتیٰ کہ بنیادی انسانی حقوق تک کے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔

اسی لیے امریکی استکبار کی مسلط کردہ جنگ کا شکار صرف وہ بہادر شہید نہیں جو جارحین کی بمباری میں اپنی جان اپنے خالق کے سپرد کرتا ہے؛ بلکہ وہ بے گھر بچہ بھی اس امریکی جارحیت کا زندہ شکار ہے جو قبضے کے جرائم کے باعث دینی اور عصری تعلیم سے محروم رہ گیا۔

⑩ انسانی حقوق کے نعروں اور عملی حقیقت کے درمیان تضاد:

امریکا اور اس کے مغربی اتحادی افغانستان کی جنگ کے دوران انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور انسانی وقار کی بہت باتیں کرتے تھے۔

لیکن میدانِ جنگ میں ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے انہی نعروں کے بارے میں سنجیدہ سوالات اٹھادیے۔

اگر انسانی حقوق کا مطلب ہر انسان کا حقِ حیات ہے تو فضائی حملوں میں شہری ہلاکتوں سے محفوظ کیوں نہ رہے؟

اگر قانون کی حکمرانی اہم ہے تو بعض قیدیوں کے مقدمات شفاف عدالتی کارروائی کے بغیر برسوں کیوں چلتے رہے؟

اگر انسانی وقار بنیادی اصول ہے تو بگرام، گوانتانامو، قندھار اور دیگر حراستی مراکز میں امریکی جلادوں کی جانب سے قیدیوں پر انسانیت سوز تشدد، بدسلوکی اور توہین کے واقعات کی اطلاعات کیوں سامنے آئیں؟

اور اگر افغان خواتین اور بچوں کا تحفظ اس بیس سالہ غیر ملکی موجودگی کا جواز تھا تو یہی افغان مائیں بیوہ، بچے یتیم اور ان کے گاؤں و گھر امریکی حملہ آوروں اور ان کی کٹھ پتلی انتظامیہ کی بارود اور جنگ کی آگ میں کیوں جلتے رہے؟

یہ تلخ سوالات بیرونی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی تاریخی یادداشت کا حصہ ہیں اور ساتھ ہی امریکی قبضے کے بیس سالہ دور کا ایک گہرا اور کبھی نہ مٹنے والا داغ بھی ہیں۔

⑪ بیرونی جارح قبضے کی تاریخی ذمہ داری اور اس کے سانحات:

تاریخی انصاف اور حقیقت کا تقاضا ہے کہ افغانستان پر مسلط کی گئی بیس سالہ جنگ اور اس دوران ہونے والے جرائم کی واضح تصویر پیش کی جائے اور جنگ کے متاثرین کے مسئلے کا مکمل جائزہ لیا جائے۔

اس بیس سالہ خونیں المیے، تباہ کاریوں اور بے گناہ افغانوں کے قتلِ عام کی بنیادی وجہ اور اصل سبب صرف اور صرف امریکی استکبار اور اس کے صلیبی اتحادیوں کی افغانستان پر فوجی جارحیت اور قبضہ تھا۔ اگر بیرونی جارحین نے ہماری پاک سرزمین پر حملہ نہ کیا ہوتا تو ہماری قوم کو ایسے سانحات، بھڑکائی گئی جنگوں اور داخلی تنازعات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

بیرونی قابض افواج اور ان کے مقامی کٹھ پتلیوں نے اپنے ناجائز مقاصد کے لیے ہماری پاک سرزمین کو بے رحمانہ فوجی تجربات کا میدان بنادیا۔ ان کی اندھی فضائی بمباری، شبانہ چھاپوں، عدالتی کارروائی کے بغیر قتل و ہلاکت اور

وسیع پیمانے پر تباہ کاریوں نے ہزاروں مظلوم افغانوں کا خون بہایا۔
بیرونی جارحین اور ان کے اندرونی اتحادی ان تمام انسانی اور تاریخی جرائم کے براہِ راست ذمہ دار ہیں اور وہ اس تاریخی و اخلاقی ذمہ داری سے کبھی فرار اختیار نہیں کر سکیں گے۔
مظلوم افغان عوام کے لیے، جن کے ہر خاندان نے بیرونی جارحیت کی بے رحمی میں اپنے بچوں، ماؤں اور اہلِ خانہ کے جنازے اٹھائے، ظالم قابضین کا جرم بالکل واضح ہے؛ اور ان مظلوم شہداء کی بہنیں اور مائیں بیرونی جارحیت اور اس کے کٹھ پتلیوں کے ان مظالم کو کبھی فراموش نہیں کریں گی۔

⑫ بیرونی قبضے کی تباہ کن معاشی وحشت:

افغانستان پر بیس سالہ امریکی جارحیت اور نیٹو کی ظالمانہ موجودگی کا سب سے سنگین اور دیرپا نقصان ہمارے ملک کی معاشی خود کفالت اور بنیادی ڈھانچے کی تباہی تھی۔
قبضے کے بیس سالوں میں غاصب بیرونی قوتوں اور ان کے اشاروں پر چلنے والی بدعنوان کٹھ پتلی انتظامیہ نے افغانستان کی حقیقی معیشت کو ترقی دینے کے بجائے ہمارے ملک کو اپنے قلیل مدتی فوجی اور خفیہ اخراجات کے ایک مصنوعی اور فریب پر مبنی چکر میں مبتلا رکھا۔ اگرچہ امریکی استکبار تعمیرِ نو کے بہت سے دعوے کرتا رہا، لیکن حقیقت میں اس نے وسائل کو بدعنوان عناصر اور اپنے حامیوں میں تقسیم کیا اور افغانستان کی حقیقی معاشی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔
جنگ بازار میں امن نہیں رہنے دیتی۔
امن نہ ہو تو سرمایہ نہیں آتا۔
سرمایہ نہ ہو تو روزگار پیدا نہیں ہوتا۔
روزگار نہ ہو تو غربت بڑھتی ہے۔
یوں جنگ کی آگ بم کے پھٹنے کے بعد بھی بجھتی نہیں؛ بلکہ برسوں بعد بے روزگاری، غربت اور سماجی مسائل کی صورت میں زندہ رہتی ہے۔

⑬ جنگ کے نفسیاتی زخم:

انسان کے جسم کا زخم کبھی کبھی چند ماہ میں مندمل ہو جاتا ہے، لیکن انسانی ذہن پر جنگ کے زخم برسوں باقی رہتے ہیں۔
افغانستان میں ایک ایسی نسل پروان چڑھی جس کے بچپن کا حصہ بموں کی آواز، ہیلی کاپٹروں کا شور، رات کے چھاپے اور جنازوں کے مناظر تھے۔

ایک بچہ جس نے اپنے والد کو صلیبیوں کی اندھی بمباری میں کھو دیا ہو، وہ برسوں بعد بھی اس رات کو فراموش نہیں کر سکتا۔

ایک ماں جس نے امریکی قبضے کی فضائی کارروائی میں اپنے بیٹے کو کھویا ہو، زندگی کے آخری دن تک اس کا نام یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی ہے۔

ایک شخص جس نے برسوں بگرام اور گوانتانامو کی بدنام اور تاریک جیلوں میں امریکی جلادوں کے تشدد اور اذیت کے تحت گزارے ہوں، وہ رہائی کے بعد بھی ان امریکی جرائم اور خوف کے باعث شدید ذہنی پریشانیوں کا شکار رہتا ہے۔

یہ وہ تاریخی اور گہرے زخم ہیں جنہیں بیرونی جارحین اور مغربی استکباری ذرائع ابلاغ کی رپورٹس میں کبھی دکھایا نہیں جاتا۔

14 بیس سالہ جنگ اور قبضہ؛ انجام بیرونی جارحین کی تاریخی شکست

امریکی جارحین اور ان کے صلیبی اتحادیوں نے تقریباً بیس سال تک افغان سرزمین پر اپنا مذموم اور ظالمانہ قبضہ مسلط رکھا۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنی جنگی طاقت کا بھرپور استعمال کیا، اربوں ڈالر افغانستان کی سرزمین پر تباہی اور قتل و غارت کی صورت میں جھونک دیے اور بے رحمی کے ساتھ افغانستان کے طول و عرض کو بارود میں جلا دیا۔

لیکن بالآخر افغانوں کی عظیم قربانیوں کے نتیجے میں بیرونی جارح فوجیں شرم ناک انخلا پر مجبور ہو گئیں اور کابل کی بدعنوان، نااہل اور ان کے اشاروں پر قائم کی گئی کٹھ پتلی انتظامیہ 2021ء میں انتہائی حیرت انگیز اور برق رفتاری سے تاش کے پتوں کے گھر کی طرح ڈھیر ہو گئی۔

اس تبدیلی اور تاریخی شکست نے یہ ثابت کر دیا:

کہ بیرونی جارحیت، طاقت اور استکبار کے ذریعے قائم کیے گئے مصنوعی نظام کسی بھی اسلامی معاشرے میں ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتے۔ جب بھی بیرونی سرپرستی اور جارحین کی بے رحمانہ بمباری کا سلسلہ رک جائے گا، اس نوعیت کی وطن فروش حکومتیں چند ہی لمحوں میں ختم ہو جائیں گی۔

امریکی حملہ آوروں اور ان کے مقامی کٹھ پتلیوں کی مسلط کردہ اس بیس سالہ قبضے کے دوران افغان عوام نے دسیوں ہزار باصلاحیت اور بہادر بیٹوں کو شہید ہوتے دیکھا، لاکھوں افغان بے گھر ہوئے، ان کے گاؤں اور آبادیاں بموں کا نشانہ بنیں؛ لیکن آخرکار افغان عوام نے جارح استکبار کو تاریخی شکست دی اور اس کے تمام مذموم منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

⑮ افغان عوام کا اصل نقصان:

ہر جنگ میں سیاست دان تقریریں کرتے ہیں، جرنیل نقشے بناتے ہیں اور بڑی طاقتیں اپنے مفادات تلاش کرتی ہیں؛ لیکن آخرکار جنگ کی اصل قیمت عام لوگ ادا کرتے ہیں۔

افغانستان کی بیس سالہ جنگ میں بھی:

ماں نے اپنا بیٹا کھویا؛

بچے نے اپنا باپ کھویا؛

عورت بیوہ ہو گئی؛

بچہ یتیم ہو گیا؛

خاندان بے گھر ہو گیا؛

کسان نے اپنی زمین چھوڑ دی؛

مریض اسپتال نہ پہنچ سکا؛

طالب علم اسکول سے محروم ہو گیا؛

گھر جنگ کے ملبے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ جنگ کی وہ انسانی قیمت تھی جسے ڈالر، فوجی رپورٹس اور سیاسی بیانات پوری طرح بیان یا ناپ نہیں سکتے۔

نتیجہ

11 ستمبر 2001ء کے واقعے کے بعد افغانستان پر شروع ہونے والی امریکی اور نیٹو کی فوجی جارحیت اور قبضہ ملک کی معاصر تاریخ کے تاریک ترین، خونیں اور تباہ کن ادوار میں سے ایک تھا۔

مغربی جارحین نے ابتدا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ، جھوٹی سلامتی، انسانی حقوق اور تعمیرِ نو کے مکّارانہ نعرے بلند کیے، لیکن بیس سالہ قبضے کے پورے عرصے میں انہوں نے بے شمار ایسے جابرانہ جرائم کیے جن میں دسیوں ہزار بے گناہ افغانوں کا خون بہایا گیا، ہزاروں خاندانوں کو ان کے گھروں اور آبائی علاقوں سے بے دخل کیا گیا، ہمارے آباد دیہات تباہ کیے گئے اور عالمی استکبار کے تمام بلند بانگ دعووں کو خاک میں ملا دیا گیا۔

گرانی اور شِنڈنڈ کے وحشت ناک فضائی سانحات، قندوز کے اسپتال پر مجرمانہ اور بے رحمانہ بمباری، شبانہ چھاپے، بگرام اور گوانتاناموکے بے رحم حراستی مراکز میں مظلوموں پر تشدد و تعذیب اور لاکھوں افغانوں کی ہجرتیں اس

امریکی قبضے کی وہ سیاہ تاریخ ہیں جنہیں کبھی ذہنوں سے محو نہیں کیا جاسکتا۔

اس بیس سالہ جارحیت کی مکمل تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام قتلِ عام، تباہی اور اجتماعی سانحات کی پوری اور بنیادی ذمہ داری امریکی جارحین، ان کے اتحادیوں اور ان کی مقامی کٹھ پتلی و دست نگر انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے؛ کیونکہ ان کی مسلط کردہ جارحیت نے ہماری اسلامی سرزمین کو جنگ اور بارود کی لپٹوں میں جھونک دیا۔

افغانستان کی بیس سالہ جنگ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ کسی قوم کو بمباری، جیل، شبانہ چھاپوں اور فوجی طاقت کے ذریعے پائیدار امن نہیں دیا جاسکتا۔

افغان عوام کا المیہ یہ ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ہمیشہ اپنی جنگیں اسی سرزمین کے سینے پر لڑنا چاہتی ہیں، لیکن ہر بار جنگ کے شہداء کے جنازے افغانوں ہی کے گھروں سے اٹھتے ہیں۔

اور آج بھی ان بیوہ خواتین، یتیم بچوں، زخمیوں اور بے گھر لوگوں کا درد تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔

جنگ کے ہتھیار ایک دن خاموش ہو جاتے ہیں، فوجیں ایک دن واپس چلی جاتی ہیں، لیکن شہید بچوں کی ماؤں کے آنسو اور تباہ شدہ گھروں کی یادیں نسلوں کی حافظے میں باقی رہتی ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو میں اسی ترجمے کو مزید ادبی، صحافتی اور اشاعتی اسلوب میں بھی سنوار سکتا ہوں، تاکہ اسے براہِ راست مضمون یا کتاب میں شامل کیا جا سکے۔

طالبان کی اسلامی تحریک کے آغاز سے ۱۵ اگست ۲۰۲۱ تک

غیاث الدین غوری

افغانستان وہ واحد سرزمین ہے جس نے "سلطنتوں کا قبرستان" کا قابلِ فخر لقب اپنی سنہری تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا ہے۔ یہ وہ قوم ہے جس نے تاریخ کے دوران مشکلات، قید، تشدد اور سینکڑوں دیگر مظالم کے باوجود کبھی ذلت اور غلامی قبول نہیں کی۔ افغانوں کی ایک عادت غلامی اور بندوں کی بندگی سے گہری نفرت رکھنا ہے، اور وہ کبھی نہیں چاہتے کہ ان سے آزادی اور عقیدہ چھین لیا جائے۔ افغانستان ہمیشہ بہادر مردوں، دلیر خواتین اور مجاہدین کی پناہ گاہ رہا ہے۔

اس سرزمین کی تاریخ جہاد، قبضے کے خلاف جدوجہد، خانہ جنگیوں اور بڑی سیاسی تبدیلیوں سے وابستہ رہی ہے۔ انہی نشیب و فراز کے درمیان طالبان کی اسلامی تحریک کا ظہور اور ۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی بمطابق ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء تک رونما ہونے والی تبدیلیاں ملک کی معاصر تاریخ کے اہم ابواب میں شمار ہوتی ہیں؛ یہ وہ باب ہے جو بدامنی اور خانہ جنگیوں کے درمیان شروع ہوا اور دو دہائیوں کی جنگ و جدوجہد کے بعد امارت اسلامیہ کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے پر منتج ہوا۔

افغانوں کے برسوں کے جہاد اور قربانیوں کے بعد بالآخر سوویت قبضے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ افغان قوم کو امید تھی کہ اس جہاد کا ثمر آزادی، امن، اتحاد اور ایک اسلامی نظام کے قیام کی صورت میں حاصل ہوگا۔ افغانوں کے لیے اسلامی نظام کا قیام ایک عظیم ارمان تھا؛ وہ ارمان جس کے حصول کے لیے انہوں نے جہاد کے برسوں میں ہزاروں قربانیاں دی تھیں۔

مختصراً، کمیونسٹ حکومت کے خاتمے کے بعد افغانستان ایک سخت اور بحرانی دور سے دوچار ہوا۔ مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان سیاسی اختلافات، اقتدار کے حصول کے لیے گروہوں اور احزاب کی رقابتیں شدت اختیار کر گئیں اور ملک خانہ جنگیوں میں الجھ گیا۔ کابل اور ملک کے بہت سے دوسرے علاقے خونریز جھڑپوں، تباہی اور عدمِ استحکام کے گواہ بنے۔

بہت سے علاقوں میں لوگ بدامنی، زور زبردستی، علاقائی حکمرانی، مسلح گروہوں کی من مانی، بدعنوانی، ظلم اور قومی و جماعتی رقابتوں کا سامنا کر رہے تھے۔ اتحاد اور استحکام کا وہ ارمان جس کے تحقق کی لوگوں کو برسوں کے جہاد کے بعد

امید تھی، سیاسی اور عسکری کشمکش کے درمیان ماند پڑ گیا۔

ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے فضل و احسان سے مظلوم افغان قوم کو نجات دلانے کے لیے افغانستان کے جنوب میں دینی مدارس اور مجاہدین کی صفوں سے ایک اسلامی تحریک ابھری۔ اس تحریک نے خود کو خانہ جنگیوں کے خاتمے، امن کے قیام، بدعنوانی کے خلاف جدوجہد اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے پابند سمجھا۔ حقیقت میں شر اور فساد کے گروہوں کے مظالم اور فساد کو ختم کرنے کے لیے ایسی تحریک کا وجود میں آنا ایک سنگین ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ یہ تحریک تیزی سے پھیلی، ایک کے بعد ایک علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لاتی گئی اور بالآخر کابل بھی امارت اسلامیہ کے مجاہدین کے ہاتھوں میں آ گیا۔

امارت اسلامیہ افغانستان کے قیام کے ساتھ ملک کا بڑا حصہ ایک متحدہ انتظامیہ اور قیادت کے زیرِ سایہ آ گیا۔ اس دور کی اہم کامیابیوں میں سے ایک خانہ جنگیوں اور وسیع پیمانے کی بدامنی کا خاتمہ تھا۔ ملک کی مواصلاتی شاہراہیں محفوظ ہوئیں، ان علاقائی کمانڈروں کا اختیار محدود کیا گیا جو اپنے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرتے تھے، اور ملک کے وسیع علاقوں میں نظم و امن قائم ہوا۔

امارت اسلامیہ نے قومی اور جماعتی تعصبات کا خاتمہ کرنے اور افغان قوم کو ایک متحدہ نظام کے زیرِ سایہ جمع کرنے کی کوشش کی۔ افغان قوم اس احسان کی مقروض ہے اور اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ بدعنوانی کے خلاف جدوجہد، امن کا قیام اور اسلامی شریعت کے احکام کا نفاذ اس نظام کے بنیادی مقاصد میں شامل تھے۔

اس کے باوجود امارت اسلامیہ کو اندرونی مخالفتوں اور بیرونی دباؤ کا بھی سامنا رہا اور افغانستان بدستور علاقائی اور عالمی تبدیلیوں کا مرکز بنا رہا۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے کو عالمِ کفر نے اسلامی نظام اور افغان قوم کی آزادی کو ختم کرنے کے لیے بہانے کے طور پر استعمال کیا اور افغانستان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔ اس واقعے کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں فوجی کارروائیاں شروع کر دیں۔

مختصر مدت میں امارت اسلامیہ کی حکومت کو سقوط کا سامنا کرنا پڑا اور امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے ملا محمد عمر مجاہد رحمہ اللہ کی ہدایت اور نصیحت کے مطابق ایک مدت کے لیے منظر سے پسپائی اختیار کی اور اقتدار کے مراکز سے دور ہو گئے۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں شاید یہ طالبان کی تحریک کا اختتام ہو، لیکن یہ اختتام نہیں بلکہ جدوجہد کے ایک نئے مرحلے کا آغاز تھا۔

غیر ملکی قابض افواج کی آمد اور ایک فاسد اور فرسودہ جمہوری نظام کے قیام کے ساتھ افغانستان ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا۔ غیر ملکی حملہ آوروں کی وسیع فوجی موجودگی تھی اور ان کی کٹھ پتلی حکومت بھی ان کے سیاسی، مالی اور فوجی تعاون سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی۔

امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے اپنی سرزمین اور اسلامی مقدسات کے دفاع کے لیے قابضین اور ان کے زرخرید غلاموں کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ نتیجتاً افغانستان نے بیس سال تک اپنی معاصر تاریخ کی طویل ترین جنگوں میں سے ایک کا تجربہ کیا۔ فوجی کارروائیوں، فضائی حملوں، بمباری، غیر ملکیوں اور ان کے حامیوں کے مظالم و وحشت، گرفتاریوں اور مسلح جھڑپوں نے ملک کے لوگوں کو جانی و مالی طور پر بھاری نقصانات پہنچائے۔

اسی عرصے میں امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے بتدریج اپنی صفوں کو دوبارہ منظم اور مضبوط کیا اور فوجی سرگرمیاں ملک کے مختلف علاقوں تک پھیل گئیں۔ جنگ کے طویل برسوں نے ہزاروں شہداء اور زخمی چھوڑے اور بے شمار خاندانوں کو اپنے عزیزوں کے سوگ میں بٹھا دیا۔ مجاہدین نے ان برسوں میں غیر ملکی قبضے اور اس کی داخلی زرخرید غلام افواج کے خلاف مزاحمت کی؛ ان افواج کے خلاف جنہوں نے غلامی اور بندوں کی بندگی کو اپنا معمول بنالیا تھا۔

اگرچہ غیر ملکی افواج کو فوجی اور تکنیکی اعتبار سے ہمہ گیر برتری حاصل تھی، لیکن جہاد اور جدوجہد جاری رہی اور غیر ملکی افواج کے انخلا کا معاملہ افغانستان کے اہم سیاسی مسائل میں شامل ہو گیا۔

برسوں کی جنگ کے بعد بالآخر امریکہ کی قیادت میں غیر ملکی قابض افواج کی موجودگی کے خاتمے کے لیے مذاکرات کا عمل شروع ہوا۔ دوحہ معاہدے نے غیر ملکی افواج کے انخلا کی راہ ہموار کی اور ان کے انخلا کے ساتھ ہی افغانستان کے سیاسی اور فوجی حالات تیزی سے تبدیل ہو گئے۔

۱۴۰۰ ہجری شمسی بمطابق ۲۰۲۱ء میں امارت اسلامیہ کے مجاہدین کی پیش قدمیاں تیز ہو گئیں، صوبے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے اور جمہوریہ اور جمہوریہ کا حکومتی ڈھانچہ غیر معمولی تیزی سے ختم ہو گیا۔

بالآخر ۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی بمطابق ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء کو کابل اس سرزمین کے بیٹوں اور مجاہدین کے ہاتھوں میں آگیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کی حمایت یافتہ کٹھ پتلی حکومت بھی سقوط کر گئی۔

سوویت یونین کے خلاف فتح سے لے کر ۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی تک افغانستان کی داستان ان کئی نسلوں کی زندگی کی داستان ہے جنہوں نے جنگوں، قبضے، داخلی اختلافات اور سیاسی تبدیلیوں کے درمیان زندگی گزاری۔

ان تمام برسوں میں ملک کی آزادی اور سیاسی خودمختاری، ایک اسلامی نظام کے قیام کے مطالبے کے ساتھ، افغان معاشرے کے ایک بڑے حصے کے اہم مطالبات اور مباحث میں شامل رہی۔
امارت اسلامیہ افغانستان کے مجاہدین کا ظہور اور قیام وہ تحریک تھی جو خانہ جنگیوں اور بدامنی کے درمیان ابھری؛ ایک مدت تک افغانستان کے بڑے حصے پر حکمرانی کی، امریکہ کے حملے کے بعد اقتدار سے ہٹادی گئی، بیس سال تک غیر ملکی افواج اور ان کی حمایت یافتہ حکومت کے خلاف جدوجہد کی اور بالآخر ۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی کو ایک بار پھر کابل واپس آگئی۔

الحمد للہ، آج افغانستان کی قوم کے پاس ایک اسلامی، آزاد اور خودمختار نظام ہے؛ یہ وہ مطالبہ ہے جو افغان قوم کی دائمی اور دیرینہ خواہشات میں سے تھا۔

لیکن وہ دشمن جو اب بھی اسلام اور اسلامی نظام کو ختم کرنے کے درپے ہیں، انہیں ان تجاوز کرنے والوں اور قابضین سے عبرت حاصل کرنی چاہیے جو اس مقدس سرزمین میں آکر رسوا اور ذلیل ہوئے؛ کیونکہ یہ آزاد اور خودمختار قوم کبھی کفار اور ان کے منصوبوں کے زیرِ تسلط آنا قبول نہیں کرے گی۔

فتوحات کا جدولِ زمانی

مغربی زون

صوبہ	قمری تاریخ
نیمروز	28 ذوالحجۃ 1442ھ
فراہ	2 محرم 1443ھ
ہرات	4 محرم 1443ھ
بادغیس	4 محرم 1443ھ
غور	5 محرم 1443ھ

جنوب مغربی زون

صوبہ	قمری تاریخ
ہلمند	5 محرم 1443ھ
قندہار	5 محرم 1443ھ
اروزگان	5 محرم 1443ھ
زابل	5 محرم 1443ھ
دایکندی	7 محرم 1443ھ

جنوب مشرقی زون

صوبہ	قمری تاریخ
غزنی	4 محرم 1443ھ
پکتیا	6 محرم 1443ھ
پکتیکا	6 محرم 1443ھ
خوست	7 محرم 1443ھ
لوگر	5 محرم 1443ھ

مشرقی زون

صوبہ	قمری تاریخ
ننگرہار	7 محرم 1443ھ
کنڑ	6 محرم 1443ھ
لغمان	6 محرم 1443ھ
نورستان	7 محرم 1443ھ

شمال مشرقی زون

صوبہ	قمری تاریخ
بدخشان	3 محرم 1442ھ
تخار	30 ذوالحجۃ 1442ھ
قندوز	29 ذوالحجۃ 1442ھ
بغلان	2 محرم 1443ھ
لوگر	5 محرم 1443ھ

شمالی زون

صوبہ	قمری تاریخ
سرپل	29 ذوالحجۃ 1442ھ
جوزجان	29 ذوالحجۃ 1442ھ
سمنگان	1 محرم 1443ھ
فاریاب	6 محرم 1443ھ
بلخ	6 محرم 1443ھ

مرکزی زون

صوبہ	قمری تاریخ	صوبہ	قمری تاریخ	صوبہ	قمری تاریخ
میدان	7 محرم 1443ھ	کابل	7 محرم 1443ھ	پروان	7 محرم 1443ھ
وردگ	7 محرم 1443ھ	کاپیسا	7 محرم 1443ھ	پنجشیر	29 محرم 1443ھ

جمہوریت کا سقوط اور ۱۵ اگست

ولید ویاڑ

۲۴ اسد، افغانستان کی معاصر تاریخ میں محض ایک عام دن نہیں، بلکہ اس کی اہمیت صرف افغانستان تک محدود نہیں؛ پوری دنیا، بالخصوص نیٹو اور امریکہ کا انجام بھی اس دن سے وابستہ ہے۔ تقریباً پچیس برس قبل امریکہ اور اس کے فوجی اتحادیوں نے ایسے وقت افغانستان پر قبضے کے لیے اتحاد قائم کیا، جب ہمارا ملک نہ کسی دوسرے ملک کے لیے خطرہ تھا اور نہ ہی ۱۱ ستمبر کے واقعے سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ افغانستان میں خانہ جنگی کا خاتمہ کرنے والا امارتِ اسلامیہ کا نظام مغرب اور امریکی اتحاد کو قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہ خالص اسلامی نظام، جو اپنی اقدار پر مضبوطی سے قائم تھا، خطے اور عالمِ اسلام میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد مثال تھا۔ دوسری جانب مغرض خفیہ ادارے اور اسلام دشمن عناصر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ امارتِ اسلامیہ کی اسلامی اقدار سے وابستگی اسے افغانستان اور خطے کی ایک مضبوط طاقت میں تبدیل کر سکتی ہے، جس کا راستہ روکنا پھر ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔

اس وقت کے امریکی صدر اور موجودہ دور میں صلیبی جنگوں کے بانی کے طور پر معروف جارج بش نے اعلان کیا کہ "یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف؛ اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔"

بالآخر اسی جارحیت کا آغاز ہوا۔ بیرونِ ملک مقیم اور خانہ جنگیوں میں ملوث بعض افغان عناصر کو آگے لا کر ایک مرتبہ پھر افغانستان میں جمہوریت کے نعروں کی آڑ میں جمہوری نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ جمہوریت مغربی جمہوریتوں کی ہو بہو نقل تھی، جس کے ستون آئین، انسانی ساختہ قوانین اور دیگر مغربی اقدار پر استوار تھے؛ ایسی اقدار جن پر خود مغرب اور امریکہ بھی عملاً پوری طرح کاربند نہیں تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ اس قبضے کے بعد امارتِ اسلامیہ نے صرف مختصر مدت کے لیے شہروں سے پسپائی اختیار کی، لیکن ازسرِنو خود کو منظم کر کے محدود وسائل کے باوجود اپنی جدوجہد کے ذریعے مغرب نواز جمہوری فکر کو چیلنج کیا اور ایک مرتبہ پھر افغان نسل کے دلوں میں جہاد و مزاحمت کی مشعل روشن کر دی۔ تقریباً دو دہائیاں افغانستان میں مغربی اتحاد کی دہشت اور ظلم کے ایک بحرانی دور کی صورت میں گزریں۔ مغرب میں مقیم اور امریکہ نواز حکمرانوں نے اپنی مرضی سے عوام اور اسلامی اقدار کے خلاف صف آرا ہونے کا راستہ اختیار کیا تھا، لیکن اس تاریک دور میں ایک امید بھی موجود

تھی۔ یہ امید امارتِ اسلامیہ کی مسلح اور فکری جد و جہد تھی، جو مجاہدین اور عام عوام کو آنے والی فتح کی نوید سنا رہی تھی۔
بالآخر یہ نوید ۲۰۲۱ء میں حقیقت بن گئی۔ مادی اور روحانی دونوں محاذوں پر جاری اس جد و جہد کے دوران سفید محمدی پرچم اسی شان سے لہراتا رہا اور آخر کار مجاہدین کے ہاتھوں ارگ (صدارتی محل) کے بلند و بالا محل کی چوٹی پر بھی لہرا اٹھا۔
ہاں! یہ ۲۴ اسد کا تاریخی دن تھا؛ وہ دن جب کابل شہر فتح اور اسلامی کامیابی کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ آزادی کے متوالے عوام عید کے دن کی مانند خوشی سے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اپنا مقدر اپنے مغربی اور امریکی آقاؤں سے وابستہ کر رکھا تھا، ہوائی اڈے کی طرف بھاگ رہے تھے، طیاروں کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور اپنی سابقہ بد اعمالیوں کی رسوائی کے خوف سے اپنے رب، اپنے وطن اور اپنے "عوام" تک کو بھول چکے تھے۔
وہ جمہوری نظام جس پر دو دہائیوں تک اربوں ڈالر کی مغربی اور امریکی سرمایہ کاری کی گئی، جس کے لیے بڑے پیمانے پر تشہیری مہمات چلائی گئیں اور آئین و دیگر وضعی اصولوں کو مسلط کر کے اسے عوام کے سامنے ہر قسم کی دہشت اور بد عنوانی کا منبع بنا کر پیش کیا گیا، پانی پر بنے نقش کی طرح مٹ گیا۔ یہاں تک کہ بہت جلد اسی مسلط کردہ نظام کے بعض ارکان نے بھی اس کی مذمت شروع کر دی اور عوام سے معافی مانگنے لگے۔
جمہوری نظام کے سقوط میں بلاشبہ امارتِ اسلامیہ کی جد و جہد کا بنیادی کردار تھا، لیکن اس جد و جہد کی بنیاد اسلامی امارت کو حاصل عوامی حمایت اور شریعتِ اسلامی سے وابستگی پر قائم تھی۔ یہی وہ دیرینہ اور تاریخی مطالبہ تھا جو ہمارے مسلمان عوام کے دلوں میں ہمیشہ سے موجود رہا اور بالآخر اسے عملی صورت میں تحقق حاصل ہوا۔
۲۴ اسد ایک طرف تاریخی فتح کا دن اور ہزاروں مقدس شہیدوں کے قافلے کی روشن منزل تھا، تو دوسری طرف جمہوریت کے سائے تلے سنگین جرائم کے مرتکب، انسانوں کے قاتل اور وطن فروشی کرنے والوں کے لیے بھی امن کا دن ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امارتِ اسلامیہ کے سربراہ اور افغانستان کے فاتح، حضرت امیر المؤمنین حفظہ اللہ تعالیٰ نے عام معافی اور درگزر کا ایسا تاریخی اور بے مثال فرمان جاری کیا جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی اور جس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔
۲۴ اسد کے بعد اس فرمان نے افغانوں کے درمیان قومی مفاہمت، باہمی اتحاد اور ایک قوم کی حیثیت سے اپنی اجتماعی شناخت کا احساس پیدا کرنے کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ امارتِ اسلامیہ کے مجاہدین نے بھی اپنے امیر کے فرمان کا مکمل احترام کرتے ہوئے ایسے بہت سے لوگوں کو اخوت و بھائی چارے کی آغوش میں جگہ دی جنہوں نے دو دہائیوں تک ظلم و بربریت کے سوا کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔

امارت اسلامیہ کی حکمرانی کے پانچ سال: کامیابیاں، چیلنجز اور آئندہ کی حکمتِ عملی!

احسان

تمہید

۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی کا دن افغانستان کی معاصر تاریخ میں تبدیلی کا ایک اہم اور فیصلہ کن دن شمار ہوتا ہے۔ اس باوقار دن افغانستان کی غیور اور سربلند قوم نے غیر ملکی جارحیت کے خلاف دو دہائیوں کے جہاد و مزاحمت کے بعد اپنی آزادی اور خود مختاری دوبارہ حاصل کی اور ملک میں اسلامی اور عوامی حاکمیت کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اگر جہاد کی گزشتہ دو دہائیاں جد و جہد اور قربانی کا دور تھیں تو فتح کے بعد کے پانچ سال اسلامی نظام کے استحکام، حکومت سازی اور عوام کی خدمت کا دور رہے ہے۔

ان پانچ سالوں کی اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ افغانستان نے نصف صدی کی جنگوں اور غیر ملکی مداخلتوں کے بعد پہلی مرتبہ ایسا موقع پایا کہ غیر ملکی افواج کی براہِ راست موجودگی کے بغیر اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرے۔ اسی لیے اس دور کو مسلط کردہ اور تابع حاکمیت سے عوام کی مرضی اور شریعت کی بنیاد پر حاکمیت کی طرف منتقلی کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دور کی کارکردگی کا جائزہ صرف ایک حکومت کی کامیابیوں کا جائزہ نہیں بلکہ ایک آزاد اور اسلامی مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک قوم کی مزاحمت اور کوششوں کی داستان بھی ہے۔

امارت اسلامیہ افغانستان نے اس مختصر عرصے میں، ظالمانہ پابندیوں اور بیرونی رکاوٹوں کا سامنا کرنے کے باوجود، جنگ کے مرحلے سے نظام سازی کے مرحلے میں منتقل ہونے میں کامیابی حاصل کی اور مختلف شعبوں میں نمایاں اور واضح کارنامے انجام دیے۔ بنیادی سوال جس کا یہ مضمون جواب دینے کی کوشش کرتا ہے، یہ ہے کہ امارت اسلامیہ نے گزشتہ پانچ سالوں میں کون سا راستہ اختیار کیا اور اسے کون سی کامیابیاں حاصل ہوئیں؟ یہ تحقیق علمی نقطۂ نظر سے، عینی حقائق اور معتبر رپورٹس کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ» (الحج: ۴۱)

"وہ لوگ کہ جب ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور

برائی سے روکتے ہیں۔"

قرآن عظیم الشان کی یہ مبارک آیت گزشتہ پانچ سالوں میں امارت اسلامیہ کی سمتِ عمل کو بہترین انداز میں بیان کرتی ہے۔

❶ امن کا استحکام اور قومی حاکمیت کی مضبوطی

امن ہر قسم کی ترقی اور آبادکاری کی بنیاد ہے اور بلاشبہ گزشتہ پانچ سالوں میں امارت اسلامیہ کے نظام کی سب سے بڑی اور نمایاں کامیابی پورے ملک میں امن کا قیام ہے۔ وہ قوم جس نے چار دہائیوں تک جنگ، بدامنی، دھماکوں، اغوا اور مسلح من مانیوں کا تلخ تجربہ کیا، آج اسلامی نظام کی حکمرانی کی برکت سے حقیقی امن کی شیرینی محسوس کر رہی ہے۔

گزشتہ پانچ سالوں میں امارت اسلامیہ نے خودسر افراد سے ہزاروں ہلکے اور بھاری ہتھیار جمع کرنے، غیر ذمہ دار گروہوں کو غیر مسلح کرنے، زور زبردستی اور قانون شکنی کی روک تھام اور دیگر اقدامات کے ذریعے پورے ملک میں قومی حاکمیت مضبوط کی ہے۔ آج بدخشان سے نیمروز اور ہرات سے ننگرہار تک ایک پرچم، ایک نظام اور ایک مقتدر حاکمیت قائم ہے؛ ملک کا کوئی بھی حصہ اسلامی نظام کے دائرۂ اقتدار سے باہر نہیں۔ یہ جغرافیائی اتحاد قوم کی دیرینہ خواہشات میں سے ایک تھا، جس کی تکمیل ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

اس کے علاوہ، امارت اسلامیہ کی منظم اور پرعزم مسلح افواج کا قیام، جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ مجاہدین سے تجاوز کرتی ہے، قومی پولیس اور ایک مضبوط و پرعزم انٹیلی جنس فورس کے ساتھ مل کر اس امر کا باعث بنا ہے کہ افغانستان کے پاس منظم، عوام کے اندر سے ابھرنے والی اور ملک کی سلامتی کے لیے پرعزم سکیورٹی فورسز موجود ہیں۔

داعش، عصر حاضر کے خوارج، کے مذموم رجحان کے خلاف امارت اسلامیہ کی فیصلہ کن، انتھک اور کامیاب جدوجہد امن کے قیام کے میدان میں نظام کی صلاحیت کی ایک اور واضح مثال ہے۔ ایسے وقت میں جب متعدد ممالک اپنے وسیع وسائل کے باوجود اس گروہ کو قابو کرنے میں ناکام رہے، امارت اسلامیہ نے اپنی سکیورٹی فورسز کی شب و روز کی کوششوں اور عوام کی مضبوط حمایت کے ذریعے اس فتنہ پرور گروہ کی کمر توڑ دی اور ثابت کیا کہ افغانستان کی سرزمین دوبارہ کبھی بدامنی کا گڑھ نہیں بنے گی۔

اقوام متحدہ کی رپورٹس نے بھی افغانستان میں شہری ہلاکتوں میں بے مثال کمی اور سکیورٹی کی صورتِ حال میں نمایاں بہتری کی تصدیق کی ہے۔

آج ہر شہری اپنی روزمرہ زندگی میں اس ہمہ گیر امن کے ثمرات کو واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے؛ وہ تاجر جو اغوا کے

خوف کے بغیر اپنا مال ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک منتقل کرتا ہے، وہ خاندان جو رات کو بے فکری کے ساتھ سفر کرتا ہے اور وہ کسان جسے اپنی فصلوں کے لوٹ لیے جانے کا خوف نہیں، سب اس بنیادی تبدیلی کے گواہ ہیں۔

اسی طرح ملک کی سرحدوں کو محفوظ بنانا اور اسمگلنگ اور غیر ملکی گروہوں کی دراندازی کی روک تھام اس امر کا باعث بنی ہے کہ افغانستان کئی سالوں کے بعد سرمایہ کاری اور علاقائی ٹرانزٹ کے لیے ایک محفوظ ملک کے طور پر سامنے آیا ہے؛ یہ وہ مقام ہے جو جمہوریہ کے بیس سالوں میں ہزاروں غیر ملکی افواج کی موجودگی کے باوجود کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔

2 متوازن اور معیشت پر مبنی خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کے میدان میں امارت اسلامیہ نے "توازن، غیر جانب داری اور مثبت تعامل" کی بنیاد پر ایک دانش مندانہ حکمتِ عملی اختیار کی ہے۔ یہ حکمتِ عملی دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے: اول، مکمل سیاسی خودمختاری برقرار رکھنا اور کسی بھی غیر ملکی طاقت کا تابع نہ ہونا؛ دوم، باہمی احترام اور قومی مفادات کی بنیاد پر دنیا کے ساتھ تعمیری اور معیشت پر مبنی تعامل۔

ماضی کے برعکس، جب افغانستان غیر ملکی طاقتوں کے درمیان مسابقت کا میدان بن چکا تھا، آج امارت اسلامیہ نے تمام ہمسایہ ممالک اور خطے کے ممالک کے ساتھ مثبت اور تعمیری تعلقات قائم کیے ہیں۔ چین، روس، ایران، ترکی، وسطی ایشیا کے ممالک اور عرب دنیا کے ساتھ سیاسی، اقتصادی اور تجارتی تعلقات میں توسیع اس حکمتِ عملی کی کامیابی کی علامت ہے۔

اہم علاقائی اور عالمی اجلاسوں میں امارت اسلامیہ کے وفود کی فعال اور باوقار شرکت اور کابل میں درجنوں اعلیٰ سطحی غیر ملکی وفود کی میزبانی اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ افغانستان مسلط کردہ تنہائی سے نکل چکا ہے اور علاقائی معاملات میں ایک اہم اور ذمہ دار فریق کے طور پر ابھر رہا ہے۔

امارت اسلامیہ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ پوری دنیا، خصوصاً عالمِ اسلام کے ساتھ اچھے تعلقات چاہتی ہے اور کسی ملک کے خلاف افغانستان کی سرزمین کسی کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔

اس متوازن سیاست کے عملی نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔ متعدد ممالک میں افغانستان کے سفارت خانوں اور قونصل خانوں کا فعال ہونا، بڑے تجارتی اور ٹرانزٹ معاہدوں پر دستخط اور ٹاپی، ٹاپ و خواف، ہرات ریلوے جیسے بڑے علاقائی منصوبوں کے بارے میں مذاکرات کا دوبارہ آغاز، یہ سب ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا بتدریج افغانستان کی موجودہ

حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے۔

امارت اسلامیہ نے ثابت کیا ہے کہ وہ سیاسی وابستگی کے بغیر اور قومی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے دنیا کے ساتھ تعامل کر سکتی ہے؛ ایسا تعامل جو غیر ملکیوں کے احکامات کی بنیاد پر نہیں بلکہ افغانستان اور امتِ مسلمہ کے اعلیٰ مفادات کی بنیاد پر ہو۔ اسی باوقار طرزِ عمل نے خطے کے مما لک کا اعتماد دوبارہ افغانستان کی طرف لوٹایا ہے۔

③ اقتصادی بحالی اور خود کفالت کی جانب پیش رفت

شاید امارت اسلامیہ کے پانچ سالہ دور کا سب سے روشن باب اس کی اقتصادی کامیابیاں ہیں؛ خصوصاً ایسے حالات میں جب نظام کو غیر منصفانہ پابندیوں اور امریکہ کی جانب سے قومی اثاثوں کے منجمد کیے جانے کا سامنا تھا۔ پہلا بڑا اقدم بدعنوانی کے خلاف سنجیدہ اور عملی جد وجہد تھی۔ وہ بدعنوانی جس نے جمہوری نظام کے دور میں اپنی جڑیں پھیلا دی تھیں اور ملک کی اقتصادی رگیں خشک کر دی تھیں، آج بے مثال حد تک محدود ہو چکی ہے اور ایک صحت مند اور شفاف انتظامیہ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

اس صحت مند انتظامیہ کا نتیجہ قومی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہے۔ وزارتِ مالیہ کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک کی داخلی آمدنی سیکڑوں ارب افغانی سے تجاوز کر چکی ہے اور قومی بجٹ کے اخراجات داخلی ذرائع سے پورے کیے جا رہے ہیں؛ یہ معاصر تاریخ میں ایک قابلِ ذکر کامیابی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ ہماری قوم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے اور بیرونی امداد پر انحصار کیے بغیر اپنی معیشت چلا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ، امارت اسلامیہ نے ان بڑے اور بنیادی قومی منصوبوں کو دوبارہ زندہ کیا ہے جو برسوں سے فراموش کیے جا چکے تھے۔ قوش ٹیپہ کا عظیم نہری منصوبہ، جو ملک کے بڑے آب پاشی منصوبوں میں سے ایک ہے، اہم شاہراہیں، پانی ذخیرہ کرنے والے ڈیم، بڑی کانوں کی کان کنی اور مقامی پیداوار، زراعت اور صنعت کے ساتھ تعاون، یہ سب اقتصادی خود کفالت کی جانب نظام کی مسلسل پیش رفت کی واضح نشانیاں ہیں۔

گزشتہ دو سالوں میں غیر ملکی کرنسیوں کے مقابلے میں افغانی کی قدر کا استحکام، ایسے وقت میں جب بہت سے ہمسایہ مما لک کی معیشتیں شدید اتار چڑھاؤ کا شکار تھیں، عالمی بینک سمیت بین الاقوامی اداروں کی جانب سے ایک اہم اقتصادی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔ جو چیز اس کامیابی کو مزید اہم بناتی ہے، وہ کسٹمز کے نظام میں بنیادی اصلاحات اور ٹیکسوں کی شفاف وصولی ہے۔ ماضی میں کسٹمز کی آمدنی ضائع ہو جاتی تھی؛ لیکن آج بہتر انتظام اور اسمگلنگ کی روک تھام کے ذریعے آمدنی صحیح طور پر قومی خزانے میں منتقل کی جاتی ہے۔

اسی طرح نجی شعبے کے ساتھ تعاون، ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے سہولتیں فراہم کرنا، ملکی مصنوعات کی نمائشوں کا انعقاد اور قالین، خشک میوہ جات اور قیمتی پتھروں کی بر آمدات میں اضافہ، یہ سب ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان کی معیشت ایک صارف اور تابع حالت سے پیداواری اور خود کفیل معیشت کی جانب بڑھ رہی ہے۔

4 اسلامی شریعت کا نفاذ، ثقافتی اور سماجی خدمات

افغان قوم کے جہاد کا بنیادی مقصد اسلامی شریعت کی حاکمیت تھا، اور امارت اسلامیہ نے گزشتہ پانچ سالوں میں عدالتوں، تعلیم اور معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں شریعت کے نفاذ کو ترجیح دی ہے۔

شرعی عدالتوں نے عوام کے مقدمات تک منصفانہ اور فوری رسائی کے ذریعے انصاف کے حوالے سے قوم کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا ہے اور لوگ آج دیکھ رہے ہیں کہ مظلوم کا حق سفارش اور رشوت کے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں اسلامی اور قومی اقدار کی بنیاد پر تعلیمی نصاب میں اصلاح، سیکڑوں اسکولوں اور مدارس کی تعمیرِ نو اور ہزاروں نوجوانوں کے لیے تعلیم و تحصیل کے مواقع فراہم کرنا بنیادی اقدامات میں شامل ہیں۔

صحت کے شعبے میں اسپتالوں اور طبی مراکز کی تعمیرِ نو اور پورے ملک میں مریضوں کا علاج مسلسل جاری ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ طبی خدمات ملک کے انتہائی دور دراز علاقوں تک بھی پہنچیں۔

بڑی انسانی اور اسلامی کامیابیوں میں سے ایک، جس نے پوری دنیا میں نمایاں تحسین حاصل کی ہے، منشیات کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد ہے۔ امارت اسلامیہ نے منشیات کی کاشت، پیداوار اور اسمگلنگ پر پابندی عائد کرنے اور گلیوں اور راستوں سے دسیوں ہزار نشے کے عادی افراد کو جمع کر کے صحت مراکز میں ان کا علاج کرنے کے ذریعے قوم اور انسانیت کی ایک عظیم خدمت انجام دی ہے؛ وہ کام جسے سابقہ نظام اربوں ڈالر کی غیر ملکی امداد کے باوجود انجام دینے سے عاجز رہا تھا۔

اس کے علاوہ، فتح کے ابتدائی دنوں میں امیر المؤمنین حفظہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عام معافی کے اعلان نے افغانستان کے مختلف اقوام کے درمیان قومی اتحاد اور بھائی چارے کو مضبوط کرنے میں کردار ادا کیا اور یہ ظاہر کیا کہ امارت تمام افغانوں کا مشترکہ گھر ہے۔ اس کے ساتھ وزارتِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے معاشرے کی روحانی اصلاح، اسلامی ثقافت کا فروغ، منکرات اور ناپسندیدہ رسوم کی روک تھام اور معاشرے کی فکری رہنمائی میں علما کے مقام کی بحالی نے ملک کے ماحول کو اسلامی روحانیت اور اخلاق کی جانب موڑ دیا ہے۔

مساجد کی تعمیرِ نو، اسلامی اور ثقافتی کتابوں کی طباعت و تقسیم، دینی مدارس کے ساتھ تعاون اور ہزاروں طلبہ کو داخل

کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی نظام ایک طرف امن اور معیشت کے قیام کے ذریعے لوگوں کی جسمانی اور مادی زندگی اور دوسری طرف دین و ثقافت کے ذریعے ان کی روح اور معنوی زندگی پر متوازن توجہ دیتا ہے؛ اور یہی توازن ہر عوامی نظام کی بقا کا راز ہے۔

5 چیلنجز اور مواقع

اگرچہ امارت اسلامیہ کے پانچ سالہ سفر کے دوران اب بھی بعض کمزوریاں اور مشکلات نظر آتی ہیں، لیکن یہ مشکلات اسلامی نظام کے ارادے کی کمزوری یا نااہلی کی وجہ سے نہیں ہیں؛ بلکہ براہِ راست ظالمانہ پابندیوں، عالمی برادری کے عدم تعاون اور ایک جائز اور عوامی نظام کو تسلیم نہ کیے جانے سے وابستہ ہیں۔

امارت اسلامیہ نے محدود داخلی وسائل کے ساتھ بڑے کام انجام دیے ہیں؛ لیکن اقتصادی پابندیوں، امریکی بینکوں میں افغان قوم کے اربوں ڈالر کے غیر ملکی زرمبادلہ کے منجمد رہنے اور عالمی ترقیاتی امداد تک رسائی نہ ہونے نے بعض شعبوں میں تعمیرِ نو اور اقتصادی ترقی کے عمل کو سست کیا ہے۔ اقوام متحدہ اور دنیا کے بڑے ممالک نے افغان قوم کے ساتھ مخلصانہ تعاون کرنے کے بجائے انسانی امداد کو سیاسی رنگ دینے اور عوام پر غیر ضروری دباؤ ڈالنے کے ذریعے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس نے افغانستان کی مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ یہ دوہرا رویہ افغانستان کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹوں میں شمار ہوتا ہے۔

یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بیرونی رکاوٹیں اور غیر منصفانہ پابندیاں ختم ہو جائیں، دنیا افغانستان کی موجودہ حقیقت کے ساتھ تعامل کرے اور موجودہ نظام کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھائے تو آج مختلف شعبوں میں جاری ترقی کئی گنا تیز ہو جائے گی۔

افغانستان کو مکمل امن، نوجوان اور مضبوط افرادی قوت، وسیع قدرتی ذخائر، وافر پانی اور ایشیا کے سنگم کی حیثیت سے اپنے بہترین جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے وہ تمام مواقع حاصل ہیں جن کے ذریعے وہ ایک آباد، خود کفیل اور مثالی ملک بن سکتا ہے۔ جس چیز کی آج کمی محسوس ہوتی ہے وہ صرف دنیا کے تعاون کا فقدان ہے، نظام کی بے بسی نہیں۔ لیتھیم، تانبے اور لوہے جیسی معدنیات کے عظیم ذخائر، جن کی مالیت کا اندازہ ہزاروں ارب ڈالر کی سطح پر لگایا گیا ہے، وہ بے قابو پانی جو ڈیموں کی تکمیل کے بعد افغانستان کو بجلی برآمد کرنے والا ملک بنا سکتا ہے، اور ملک کی نوجوان اور دیندار آبادی، یہ وہ عظیم اثاثے ہیں جنھیں کوئی پابندی ہمیشہ کے لیے قابو نہیں کر سکتی۔

گزشتہ پانچ سالوں کے تجربے نے ثابت کیا ہے کہ جب بھی تعاون کے راستے کھلے ہیں، امارت اسلامیہ نے سرمایہ

کاری کو راغب کرنے، نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور مختصر مدت میں افغانستان کو خطے کے درمیان رابطے کے مرکز میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ لہٰذا، اصل چیلنج پابندیاں ہیں اور اصل موقع متحد قوم اور نظام ہے۔

6 نتیجہ

امارت اسلامیہ کی پانچ سالہ حکمرانی کی کارکردگی واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ یہ نظام استحکام کے ایک مشکل مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے۔ گزشتہ پانچ سال ثبوت کے سال تھے: انہوں نے ثابت کیا کہ افغان دین اور قومی اتحاد کی مدد سے امن قائم کر سکتے ہیں، بدعنوانی کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور غیر ملکیوں پر انحصار کیے بغیر اپنے ملک کا انتظام چلا سکتے ہیں۔

اب آئندہ کا راستہ واضح ہے: نظام کے استحکام سے پائیدار ترقی اور خوشحالی کی جانب پیش رفت۔

اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ پر توکل، قوم کے اتحاد، امارت اسلامیہ کی حکیمانہ قیادت، ظالمانہ پابندیوں کے خاتمے اور دنیا کے حقیقی تعاون کے آغاز کے ساتھ افغانستان تیزی سے آباد کاری، خود کفالت اور ہمہ گیر ترقی کی جانب قدم بڑھا سکتا ہے، اور افغانستان کا مستقبل آج کے مقابلے میں مزید روشن ہوگا۔ اسلامی نظام کے سائے تلے ایک آباد، آزاد اور مضبوط افغانستان کی امید کے ساتھ!

7 مآخذ

۱۔ امیر المؤمنین حفظہ اللہ تعالیٰ کے اعلانات اور فرامین۔
۲۔ وزارتِ مالیہ اور مرکزی افغانستان بینک کی سالانہ رپورٹس۔
۳۔ افغانستان میں اقوام متحدہ کے امدادی مشن (یوناما) کی رپورٹس۔
۴۔ افغانستان کی معیشت کے بارے میں عالمی بینک کی رپورٹس۔
۵۔ امارت اسلامیہ کی وزارتِ تعلیم، وزارتِ صحتِ عامہ اور انسدادِ منشیات سے متعلق وزارتوں اور اداروں کی رپورٹس۔
۶۔ سیاست دانوں، ثقافتی کارکنوں اور قانونی ماہرین کے تجزیے۔

تیسری فصل

معاصر خوارج

فتح کے بعد؛ داعش کے خلاف امارتِ اسلامیہ کی کامیاب جد وجہد

قیس سعید

جب ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء (۲۴ اسد ۱۴۰۰ ہجری شمسی) کو کابل کے بلند میناروں پر فتح کا سفید پرچم لہرا اٹھا اور غیر ملکی قابض افواج کی بیس سالہ پیچیدہ فوجی موجودگی، استشہادی جانبازوں اور مخلص مجاہدین کے بے مثال عزم کے سامنے حیرت انگیز طور پر زمین بوس ہو گئی، تو ملک کی آزادی کے اس عظیم انقلاب کو بے وقعت اور بدنام کرنے کے لیے خفیہ و اعلانیہ انٹیلی جنس اداروں نے اپنا آخری اور نہایت خبیث مہرہ میدان میں اتار دیا۔ یہ انتہاپسندانہ منصوبہ ''داعش'' کے نام سے سامنے آیا، جس کی حقیقی نوعیت اسلامی نظام کے خلاف علاقائی اور عالمی خفیہ اداروں کے مفادات کی تکمیل تھی۔

ان فتنے کے علمبرداروں اور ان کے پسِ پردہ موجود سیاسی و انٹیلی جنس سرپرستوں کا خیال تھا کہ امارتِ اسلامیہ کا نوزائیدہ نظام ابتدائی دور میں انتظامی ڈھانچے کی تشکیل، مفلوج معیشت کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور سیکیورٹی اداروں کو منظم کرنے میں اس قدر مصروف ہوگا کہ انہیں اپنی سرگرمیوں کے لیے آسانی سے میدان مل جائے گا۔ وہ بے گناہ مسلمانوں اور عام شہریوں کی عبادت گاہوں اور تعلیمی مراکز پر حملے کر کے نفسیاتی جنگ اور عمومی خوف و ہراس کو فروغ دینا اور عوام کا نظام پر اعتماد متزلزل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے مجاہدین کی اعلیٰ انٹیلی جنس صلاحیتوں، غیر متزلزل عزم اور عوام کی کھلی حمایت کو کم تر سمجھا۔

فتح کے فوراً بعد اس فتنے کا قلع قمع کرنے کے لیے امارتِ اسلامیہ نے جو حکمتِ عملی اختیار کی، وہ نہایت مؤثر ثابت ہوئی۔ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس اور خصوصی فورسز نے ملک بھر میں اس انتہاپسند نیٹ ورک کے خلاف وسیع، منظم اور فیصلہ کن کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ کابل، ننگرہار، کنڑ، جوزجان اور فاریاب میں اس گروہ کے اہم مراکز اور دہشت گردی کے خفیہ ٹھکانے اچانک اور شدید کارروائیوں کی زد میں آئے۔ ان جھڑپوں اور اہم آپریشنز کے نتیجے میں اس گروہ کے سیکڑوں ملکی و غیر ملکی ارکان ہلاک کیے گئے اور وہ تمام نیٹ ورک مفلوج کر دیے گئے جو بیرونِ ملک سے افغانستان میں جنگجوؤں کی منتقلی کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

انہیں سب سے کاری ضرب اس وقت لگی جب اس فتنے کے فوجی منصوبہ ساز اور اہم رہنما نہایت دقیق اور برق رفتاری سے کیے گئے حملوں کا نشانہ بنے۔ ان میں اس گروہ کا مرکزی فوجی ذمہ دار، جس کا اصل نام کوثری اور تنظیم میں قاری فاتح کے نام سے معروف تھا؛ سابق گورنر اور بعد میں مرکزی قاضی شیخ محمد؛ فوجی امور کا ایک اہم کمانڈر اعجاز امین آہنگر (ابو عثمان کشمیری)؛ اور مالی و تشہیری امور کا نگران حسین شامل تھے۔ یہ تمام اہم افراد اپنے مذموم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے کابل، ننگرہار اور بلخ میں جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس کی ہدفی کارروائیوں کے دوران اپنے خفیہ ٹھکانوں میں مارے گئے۔

ان عسکری کارروائیوں کے ساتھ ساتھ سب سے اہم محاذ ان کے مالی اور تشہیری ذرائع کا خاتمہ تھا۔ جیسا کہ واضح ہے، اس نوعیت کے انتہاپسند اور تکفیری گروہ کسی افغانی اسلامی معاشرے میں کبھی عوامی فکری یا مادی بنیادیں قائم نہیں کر سکتے، بلکہ ان کا تمام انحصار بیرونِ ملک سے آنے والی رقوم، غیر ملکی انٹیلی جنس سرپرستوں کی مالی معاونت اور انٹرنیٹ کے مجازی منبروں پر ہوتا ہے۔

امارتِ اسلامیہ نے ان کے مالی ذرائع پر کڑی نگرانی قائم کی، غیر قانونی مالی رقوم کی منتقلی کو محدود کیا اور دوسری جانب ملک کے ممتاز علماء نے مذہبی فتووں اور شفاف تحقیقات کے ذریعے اس تکفیری گروہ کا اصل چہرہ افغان عوام کے سامنے بے نقاب کیا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ان کے مالی وسائل خشک ہو گئے بلکہ ان کے نام نہاد اسلامی نعروں کی حقیقت بھی عوام پر عیاں ہو گئی۔

آج جب اس تاریخی فتح کو پانچ سال مکمل ہونے والے ہیں، تو وہ فتنہ جس کے بارے میں علاقائی و عالمی خفیہ ادارے اور مغربی ذرائع ابلاغ بڑی جنگوں اور وسیع پیمانے پر انتشار برپا ہونے کی پیش گوئیاں اور پروپیگنڈا کر رہے تھے، منظم انداز میں شکست، زوال اور نابودی کی طرف پہنچ چکا ہے۔

اماراتی اداروں کی پیشہ ورانہ اور برق رفتار کارروائیوں نے نہ صرف افغانستان کے جغرافیائی حدود کو داعش کی کسی بھی مستقل موجودگی اور سرگرمی سے پاک کر دیا، بلکہ پورے خطے اور ہمسایہ ممالک کے لیے بھی یہ امر واضح کر دیا کہ کابل

خوارج، کفار کے بجائے مسلمانوں کے قتل کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

نعمان سعید

الحمد للہ، والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ، وعلی آلہ وصحبہ، امابعد:

قدیم اور جدید خوارج کی پوری تاریخ میں آپ کو ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملے گا کہ انہوں نے کسی سرزمین کو کفار یا مشرکین سے فتح کیا ہو، پھر وہاں اسلام اور مسلمانوں کی حکومت قائم کی ہو، یا وہاں کے مقامی کفار و مشرکین نے اسلام قبول کیا ہو۔

اسی طرح خوارج کی پوری تاریخ میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ وہ خالص مشرکین یا کفار کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں، حالانکہ تاریخ کے بعض ادوار میں خوارج قوت، شان و شوکت، تعداد اور وسائل کے اعتبار سے خاصی طاقت رکھتے تھے۔ مگر ان کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر جگہ انہی مسلمانوں کے خلاف اٹھے ہیں جو کفار کے راستے میں رکاوٹ تھے، یا جو ان کے تکفیری نظریے سے متفق نہ تھے۔ مسلمانوں کے قتل، اذیت اور صفایا کرنے میں انہوں نے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اس تحریر میں سب سے پہلے ہم قدیم اور جدید خوارج کے فکری، اعتقادی اور ہدفی اتحاد اور ان کے باہمی مشترک نکات کا مختصر جائزہ لیں گے، پھر احادیثِ نبویہ اور سابقہ علما کے اقوال کی روشنی میں اس بات کو واضح کریں گے کہ خوارج کا اصل ہدف مسلمان کیوں ہوتے ہیں؟ اور وہ کفار کے بجائے مسلمانوں کے قتل کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

قدیم اور جدید خوارج کی مشترکہ خصوصیات

❶ قوت اور وسائل

موجودہ خوارج، جیسے داعش، قدیم خوارج کی طرح قوت، وسائل اور امکانات رکھتے ہیں؛ لیکن ان وسائل کو مشرکین اور کفار کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

❷ مسلمانوں کا قتل

موجودہ خوارج بھی سابقہ خوارج کی طرح اپنی منحرف اور نفسانی تاویل، غلط تفسیر اور خود ساختہ تعبیر کی بنیاد پر ہر اس شخص کو مسلمان نہیں سمجھتے جو ان کے نظریے کو قبول نہ کرے یا ان کی مخالفت کرے۔ جس طرح قدیم خوارج

مسلمانوں کو قتل کرتے اور کفار کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے، اسی طرح آج کے خوارج بھی مسلمانوں اور باقاعدہ اسلامی حکومتوں پر حملے کرتے ہیں۔

③ کفار کے خلاف کمزور رویہ

قدیم خوارج مشرکین اور کفار کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ بعینہٖ یہی حال جدید خوارج کا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات وہ غیر مسلموں کے خلاف بھی کوئی کارروائی کرتے ہیں، لیکن وہ نہایت کمزور اور محدود ہوتی ہے، عموماً کسی خاص منصوبے کے تحت؛ جبکہ ان کی اصل توجہ اسلامی معاشرے کے اندرونی اختلافات اور فتنوں پر ہوتی ہے۔

④ اختلاف اور انتشار کو ہوا دینا

قدیم خوارج کی طرح جدید خوارج بھی مسلمانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جھگڑوں کے مواقع پر سر اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد اور منصوبوں کے لیے فتنہ، تقسیم اور انتشار کو فروغ دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے کسی بھی درجے کے تشدد سے گریز نہیں کرتے۔

⑤ فکری انحراف اور غلط تاویلات

قدیم خوارج کی طرح آج کے خوارج بھی شریعتِ اسلامی کے نصوص اور سنت پر صحیح طور پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اپنے انتہاپسندانہ فہم، منحرف تاویل، غلط تفسیر اور نفسانی تعبیر کی بنیاد پر ہر شخص اور ہر معاملے کا فیصلہ کرتے ہیں۔
اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ خوارج کفار کے بجائے مسلمانوں کو کیوں قتل کرتے ہیں اور مسلمانوں کے قتل کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟
علما فرماتے ہیں کہ خوارج کا مشرکین کے ساتھ قتال نہ کرنا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی واضح نشانیوں میں سے ہے؛ کیونکہ نبی ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:
«یقتلون أہل الإسلام، ویدعون أہل الأوثان، یمرقون من الإسلام کما یمرق السہم من الرمیۃ»
یعنی: ”وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے، اور اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے“ (بخاری و مسلم)
علامہ قرطبی رحمہ اللہ اپنی کتاب المفہم میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ”وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے“ غیب کی خبر ہے جو بعینہٖ اسی طرح پوری ہوئی، اور یہ آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ یہ ان غیبی خبروں میں سے ہے جن کی نبی ﷺ نے خبر دی، اور وہ بالکل اسی طرح واقع ہوئیں جیسا آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

ابن حزم رحمہ اللہ الفصل میں لکھتے ہیں کہ خوارج ہر اس شخص کا امتحان لیتے تھے جو ان کے لشکر سے تعلق نہیں رکھتا تھا؛ اگر وہ کہتا کہ میں مسلمان ہوں تو اسے قتل کر دیتے، جبکہ یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کو قتل کرنا حرام سمجھتے تھے۔

اسی پر رسول اللہ ﷺ نے گواہی دی کہ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے، اور یہ آپ ﷺ کی نبوت کی روشن دلیل ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کتاب السنۃ میں روایت کرتے ہیں کہ عون بن عبد اللہ کہتے ہیں: عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے مجھے خوارج کے پاس بھیجا۔ میں نے ان سے کہا: کیا تمہارے پاس اپنے دوست اور دشمن کو پہچاننے کی کوئی علامت ہے؟ انہوں نے کہا: ہمیں سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا: تمہارے نزدیک دوست کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ کہے: میں نصرانی ہوں، یا یہودی ہوں، یا مجوسی ہوں، تو تم مطمئن ہو جاتے ہو؛ اور دشمن کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ کہے: میں مسلمان ہوں، تو تم اس سے ڈرتے ہو۔

امام شاطبی رحمہ اللہ الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ خوارج نے فاسد تاویل کی بنیاد پر مسلمانوں سے جنگ شروع کی، انہیں غیر موحد قرار دیا، اور کفار و نصاریٰ کے خلاف جنگ کو ترک کر دیا۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ خوارج کی سب سے بڑی برائی، جس پر نبی ﷺ نے سخت نکیر فرمائی، یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور مشرکین کو چھوڑ دیتے ہیں، اور یہ لوگ عموماً مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔

صومالیہ میں داعش کا ظہور اور پس منظر!

احرار جمشید

مشرقی افریقہ میں داعش کی صومالیہ شاخ، جسے "ابناء الخلافہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اکتوبر ۲۰۱۵ء میں اس وقت وجود میں آئی جب الشباب جہادی تحریک کے ایک رکن عبد القادر مؤمن نے، جو اپنی صفوں میں ایک متشدد اور اختلاف پسند شخص سمجھا جاتا تھا، اپنے زیرِ قیادت ساتھیوں کے ایک گروہ کے ساتھ علیحدگی اختیار کی۔
عبد القادر مؤمن صومالیہ کے نیم خود مختار علاقے پنٹ لینڈ میں سرگرم تھا۔ اس نے اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ ایک ویڈیو پیغام کے ذریعے داعش کے اُس وقت کے سربراہ ابو بکر البغدادی سے بیعت کا اعلان کیا۔
یہ بیعت داعش کی صومالیہ شاخ کے قیام کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔
سکیورٹی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس وقت صومالیہ میں الشباب جہادی تحریک تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ان کے مطابق افریقی ملک کی مرکزی حکومت اور بعض غیر ملکی انٹیلی جنس اداروں کے باہمی تعاون اور مشاورت سے جہادی تحریکوں کو روکنے کے لیے عبد القادر مؤمن کی قیادت میں اس گروہ کو ایک طویل عرصے تک فعال رکھا گیا اور اسے داعش کے مرکزی مرکز، شام، کے ساتھ رابطے میں لایا گیا۔
بیعت کے بعد ابتدا میں یہ شاخ بہت چھوٹی تھی۔ اس کے الشباب جہادی تحریک اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ شدید جھڑپیں ہوتی رہیں۔ تاہم دسمبر ۲۰۱۷ء میں داعش کی مرکزی قیادت نے اسے باضابطہ طور پر اپنی ایک ولایت کے طور پر تسلیم کر لیا اور اسے "ولایۃ الصومال" کا نام دیا۔
یہ گروہ بنیادی طور پر پنٹ لینڈ، یعنی شمال مشرقی صومالیہ، بالخصوص باری کے پہاڑی علاقوں میں سرگرم ہے۔
داعش کی صومالیہ شاخ کے دوبارہ مضبوط ہونے کے اسباب:
گزشتہ برسوں میں داعش کی صومالیہ شاخ نسبتاً کمزور رہی، تاہم ۲۰۲۴ء اور ۲۰۲۵ء میں اس کی سرگرمیوں اور قوت میں دوبارہ اضافہ دیکھا گیا۔ اس کے دوبارہ ابھرنے کے اہم اسباب درج ذیل ہیں:

اول: کمزور مرکزی حکومت اور مسلسل سیاسی عدم استحکام

صومالیہ میں کمزور مرکزی حکمرانی اور مسلسل سیاسی عدم استحکام داعش کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔

بالخصوص پنٹ لینڈ کے علاقے میں، جو نیم خود مختار حیثیت رکھتا ہے، حکومتی کنٹرول کمزور ہے، قبائلی تنازعات عام ہیں اور معاشی مشکلات نے لوگوں کو مایوسی سے دوچار کر رکھا ہے۔ داعش ان خلا اور کمزوریوں کو اپنے لیے ایک موقع سمجھتی ہے، لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کرتی ہے اور یوں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دیتی ہے۔

دوم: غیر ملکی جنگجوؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد

صومالیہ میں داعش کے جنگجوؤں میں غیر ملکیوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اندازے کے مطابق تقریباً ۶۰ فیصد جنگجو غیر ملکی ہیں۔ یہ افراد دیگر افریقی اور علاقائی ممالک سے آتے ہیں اور داعش کے لیے ایک نسبتاً مضبوط اور منظم قوت تشکیل دیتے ہیں۔

اسی طرح داعش کا سربراہ عبد القادر مؤمن بھی ایک طویل عرصے سے صومالیہ میں موجود ہے اور عالمی داعش کی قیادت میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسے بھی اس گروہ کے لیے مالی اور لاجسٹک معاونت کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

سوم: مالی وسائل کا حصول

داعش نے پنٹ لینڈ میں جبری وصولیوں (Extortion) اور حتیٰ کہ کرپٹو کرنسیوں کے ذریعے بھی اپنے لیے مضبوط مالی ذرائع پیدا کر لیے ہیں۔ وہ تاجروں اور کمپنیوں سے ماہانہ رقم وصول کرتی ہے، اور رقم ادا نہ کرنے والوں کو دھمکیاں دیتی یا ان پر حملے کرتی ہے۔

مثال کے طور پر، ۲۰۲۴ء میں بوصاصو شہر کے بعض بڑے ہسپتالوں اور کمپنیوں کو اس لیے بند ہونا پڑا کہ وہ داعش کو مطلوبہ رقم ادا نہیں کر رہے تھے۔

مغربی اداروں اور اقوامِ متحدہ کی رپورٹس کے مطابق داعش صومالیہ میں تاجروں، کمپنیوں، درآمدات، مویشی پالنے اور زراعت سے جبری ٹیکس یا زکوٰۃ کے نام پر لاکھوں ڈالر وصول کرتی ہے۔ یہ رقم جنگجوؤں کی تنخواہوں، اسلحے اور نئے افراد کی بھرتی پر خرچ کی جاتی ہے۔

چہارم: الشباب سے مسابقت اور علاقائی عدم استحکام

الشباب جہادی تحریک کے ساتھ جاری مسابقت اور دوسری جانب خطے میں پیدا ہونے والی بدامنی، مثلاً مغربی افواج کی محدود موجودگی اور اٹمیس (ATMIS) مشن میں آنے والی تبدیلیوں نے بھی داعش کے لیے ایک نیا موقع پیدا کر دیا ہے۔

اگرچہ داعش، الشباب جہادی تحریک کے مقابلے میں نسبتاً کمزور دکھائی دیتی ہے، لیکن عالمی داعش نیٹ ورک کے ساتھ اس کے روابط اسے مالی اور عملی فوائد فراہم کرتے ہیں، جس کے باعث اس کی سرگرمیوں اور اثر و رسوخ میں تیزی آئی ہے۔

ہجرت کا تقدس اور داعش کا ناجائز استعمال!

خالد احرار

اسلامی تعلیمات میں ہجرت ایک عظیم اور مقدس تصور ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
«وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ» (النحل: 41)۔

ہجرت کا مطلب ظلم اور کفر کے ماحول سے نکل کر اسلامی زندگی اور عقیدے کے تحفظ کے لیے نقل مکانی کرنا ہے۔
حضرت محمد ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم مرحلہ تھا، جو صبر، قربانی اور ایمانی قوت کی علامت بن چکا ہے۔

حقیقی ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ ذاتی مفادات یا کسی گروہ کے سیاسی ایجنڈے کے لیے۔ لیکن داعش جیسی انتہاپسند تنظیمیں، خصوصاً اس کی خراسان شاخ، اس مقدس تصور کا ناجائز استعمال کرتی ہیں۔ وہ ہجرت کو عقیدے کے تحفظ یا اسلامی زندگی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے پروپیگنڈہ اور جنگی مقاصد کے لیے ایک ذریعہ بناتی ہیں۔

داعش اپنے پروپیگنڈہ حربوں (سوشل میڈیا، خراسانی داعش کے متعلقہ رسائل اور دیگر ذرائع میں) ہمیشہ "خلافت" کے قیام اور "تمکین" کی بات کرتی ہے۔ وہ بیرونِ ملک مسلمانوں، خصوصاً پاکستان، وسطی ایشیا اور حتیٰ کہ یورپ سے تعلق رکھنے والوں کو یہ پیغام دیتی ہے:

"یہاں تمکین موجود ہے، مراکز قائم ہیں، سب کچھ منظم اور تیار ہے۔"

"ہجرت کرو، یہاں تمہیں گھر، عزت، بھائی چارہ اور خلافت میں حصہ ملے گا۔"

"تمہاری ہجرت اسلام کے لیے ایک عظیم مقام رکھے گی۔"

بظاہر یہ وعدے پرکشش اور دلکش لگتے ہیں، کیونکہ بہت سے نوجوان اپنے مما لک میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ وعدے اکثر جھوٹ اور دھوکہ ہوتے ہیں۔ داعش، جو پاکستان میں کھلے عام سرگرم ہے، مکمل اس کے پاس تمکین یا کوئی حقیقی خلافت قائم نہیں۔ اس کے نیٹ ورکس پوشیدہ ہیں، سرحدی علاقوں اور جنگلات میں اس کے ٹھکانے ہیں، اور اس کی زیادہ تر کارروائیاں مسلمانوں کو نشانہ بناتی ہیں، نہ کہ کوئی حکومت یا اسلامی نظام کے قیام پر مرکوز ہیں۔

بہت سے لوگ جو خلوصِ نیت سے ان کے پرکشش اور تراشیدہ وعدوں (قیامِ خلافت) پر "ہجرت" کرتے ہیں، درحقیقت خراسانی داعش کے ہاتھوں افغانستان اور خطے میں عام مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ سب کچھ تیار ہے، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد انہیں عملی جنگ یا دیگر مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ 2025-2026 کے دوران بھی ایسی رپورٹس سامنے آئی ہیں کہ داعش نے غیر ملکی افراد کو بھرتی کیا ہے۔

داعش کی "خلافت" صرف میڈیا میں موجود ہے، جبکہ حقیقت میں یہ چند انتہاپسند عناصر کی خفیہ سرگرمیوں اور حملوں تک محدود ہے۔ وہ "ہجرت" کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ فتنہ، قتل اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ہوتا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ غلط استعمال کیوں خطرناک ہے؟

اوّل: ہجرت کے تقدس کی بے حرمتی: ہجرت ظلم سے نجات اور اسلامی زندگی کے لیے ہے، نہ کہ دہشت گردی اور فساد کے لیے۔

دوم: نوجوانوں کی تباہی: بہت سے بے گناہ لوگ نیک نیتی سے جاتے ہیں، مگر یا تو مارے جاتے ہیں یا جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

سوم: مسلمانوں کے درمیان فتنہ: خراسانی داعش کے حملوں میں زیادہ تر مسلمان ہی نشانہ بنتے ہیں، جبکہ مسلمان کا قتل سب سے بڑا فتنہ ہے۔

چہارم: پرفریب پروپیگنڈہ: میڈیا میں دکھائی جانے والی "تمکین" دراصل چند انتہاپسندوں کی تصاویر اور ویڈیوز ہوتی ہیں، جو حقیقت کو چھپاتی ہیں۔

اس تمام تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت ایک مقدس عمل ہے جس کو اسلام میں عظیم مقام حاصل ہے، لیکن داعش جیسی تنظیموں نے اسے اپنے تخریبی ایجنڈے کے لیے استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے پروپیگنڈے سے ہوشیار رہیں اور معتبر علماء کی رہنمائی کے بغیر کسی بھی قسم کی "ہجرت" کا فیصلہ نہ کریں۔ حقیقی اسلام امت کے اتحاد کا داعی ہے، نہ کہ قتل و فساد کا۔

داعش کا یہ طرزِ عمل 2025-2026 میں بھی جاری ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کا مطالعہ کرے، جھوٹے وعدوں سے بچے اور کسی کے فریب میں نہ آئے۔

چوتھی فصل

دینی اور جہادی تحریریں

غرناطہ کل، غزہ آج: اسلام کے آخری مورچے کی بقا کی جنگ!

نعمان سعید

اندلس میں اسلامی سلطنتِ غرناطہ کا مزید دو صدیوں تک قائم رہنا اسلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا۔ یہ مسلم جزیرہ، جو صلیبی دنیا کی نفرت، دشمنی اور تاریخی مکاریوں کے طوفانی سمندر میں تیر رہا تھا، کبھی بھی اتنی طویل اور یادگار مزاحمت نہ کر پاتا اگر اس کی مزاحمت کی روح اسلامی عقیدے اور اصولوں سے پھوٹ نہ نکلی ہوتی۔

اسلامی عقیدے کے بغیر یہ چھوٹی سی سلطنت ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اندلس میں دشمن کے سامنے تنہا ڈٹ جاتی، جبکہ اس سے پہلے تمام مسلم شہر اور قلعے دو صدیوں قبل ہی سقوط کر چکے تھے۔ اس چیلنج کا حقیقی جواب وہی راز تھا جس نے غرناطہ کو دو صدیوں تک اسلامی فکر اور عظیم تہذیب کا گہوارہ بنائے رکھا۔ غرناطہ کے باشندے بخوبی جانتے تھے کہ وہ ایسے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں جو ہر موقع کی تاک میں ہیں کہ انہیں مٹا دیں، اور یہ بھی جانتے تھے کہ عالمِ اسلام سے کوئی بڑی مدد پہنچنا ممکن نہیں، اس لیے انہیں اپنی ہی قوت اور اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

یہی احساس ان کے لیے سب سے بڑا محرک بنا، تاکہ وہ ہر حال میں تیار رہیں، جہاد کا پرچم بلند رکھیں اور اپنے اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ اسی استقامت کے باعث غرناطہ 1492ء (897ھ) تک اسلامی اندلس کا تاج رہا، علوم و فنون کا مینار اور یورپ میں اسلامی تہذیب کی آخری روشن مشعل بنا رہا۔

تاہم غرناطہ کے سقوط سے چند برس پہلے اندلس کے حالات بدلنے لگے۔ عیسائیوں کا ایک عظیم اتحاد وجود میں آیا جس میں اسلام کے خلاف دو بڑی عیسائی سلطنتیں، یعنی ارغون اور قشتالہ، متحد ہو گئیں۔

یہ اتحاد قشتالہ کی ملکہ "ازابیلا" اور ارغون کے بادشاہ "فرڈیننڈ" کی شادی کے ذریعے مکمل ہوا۔ ان دونوں کیتھولک حکمرانوں کا خواب یہ تھا کہ غرناطہ فتح کریں، اپنا ماہِ عسل الحمرا کے محل میں گزاریں اور غرناطہ کے سب سے بلند برج پر صلیب نصب کریں۔

دوسری طرف غرناطہ کی اسلامی سلطنت اندرونی اختلافات کا شکار تھی، خصوصاً حکمران خاندان کے درمیان شدید کشمکش موجود تھی۔ باقی ماندہ غرناطہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک حصے پر دارالحکومت غرناطہ میں ابو عبد اللہ محمد بن ابوالحسن النصری (غرناطہ کا آخری بادشاہ) حکومت کر رہا تھا، جبکہ دوسرے حصے، وادی آش اور اس کے گرد و نواح پر اس کا چچا ابو عبد اللہ محمد حکمران تھا۔

894ھ میں کیتھو لک حکمرانوں نے وادی آش اور اس سے ملحقہ علاقوں پر حملہ شروع کیا اور وادی آش، المریہ، بسطہ اور دیگر علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے غرناطہ کے دروازوں تک جا پہنچے۔ اس کے بعد انہوں نے ابو عبد اللہ النصری کے پاس سفیر بھیجے اور مطالبہ کیا کہ وہ خوبصورت محلِ الحمراان کے حوالے کر دے اور خود ان کی سرپرستی میں غرناطہ میں زندگی بسر کرے۔

تاریخ کے بار بار دہرائے جانے والے ادوار کے دیگر کمزور حکمرانوں کی طرح یہ بادشاہ بھی کمزور ثابت ہوا، اسی لیے اس دن کے لیے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ اس مطالبے کا مطلب اندلس کی آخری اسلامی سلطنت کی خودسپردگی ہے، اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ یوں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی جو دو برس تک جاری رہی۔

اس جنگ میں ایک مسلمان جوانمرد ایسا بھی تھا جو مجاہدین کے دلوں میں غیرت اور استقامت کی آگ روشن رکھے ہوئے تھا۔ وہ "موسیٰ بن ابی الغسان" تھا، ایک ایسا جانباز جو سورج کی آخری کرن کی مانند غروب ہونے سے پہلے نمودار ہوا۔ اسی مجاہد اور اس کے ساتھیوں کی بدولت غرناطہ دو سال تک کیتھو لک حکمرانوں کے سامنے ڈٹا رہا اور سات ماہ تک سخت محاصرے کا سامنا کرتا رہا۔

اس کے باوجود جنگ کا نتیجہ تقریباً واضح تھا، کیونکہ ابو عبد اللہ وہ شخص نہ تھا جو باقی ماندہ سلطنت کو ایک حقیقی مرد کی طرح بچا سکتا۔ داخلی اختلافات اور اندرونی تقسیم عیسائی محاذ کے مکمل اتحاد کے مقابلے میں ان کے لیے مزید کمزوری بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ طویل عرصے کے تاریخی انحرافات، نسلی تعصبات، غیر شرعی اور غیر اصولی جھگڑے اور وہ تمام بیماریاں جو پہلے گرنے والی اسلامی سلطنتوں سے ورثے میں ملی تھیں، سب نے مل کر اندلس میں اسلام کی آخری شمع بھی بجھادی۔

جب غرناطہ کا آخری بادشاہ ابو عبد اللہ کشتی پر سوار ہو کر اسلامی غرناطہ سے روانہ ہوا اور اس سرزمین کو آخری سلام کہہ رہا تھا جس نے آٹھ صدیوں تک یورپ میں اسلام کے سائے تلے سانس لی تھی، تو اس دردناک اور المیہ منظر میں وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر رو پڑا۔ تب اس کی ماں نے تاریخ کا وہ مشہور جملہ کہا:

"اب عورتوں کی طرح اس سلطنت پر روؤ جسے تم مردوں کی طرح بچا نہ سکے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس ایک جملے میں اس ماں نے صرف اپنے بیٹے کو نہیں، بلکہ عالمِ اسلام کے ان تمام حکمرانوں کو بھی ملامت کر دیا جو ان سلطنتوں پر روتے رہے جنہیں وہ مردوں کی طرح بچا نہ سکے تھے۔

خوبصورت اسلامی غرناطہ کے سقوط کی داستان صرف تاریخ کا ایک سیاہ باب نہیں، بلکہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک زندہ سبق، ایک دردناک عبرت اور آنے والی نسلوں کے لیے تنبیہ کی گھنٹی ہے۔ غرناطہ اس وقت نہیں گرا جب دشمن طاقتور ہوا، بلکہ اس وقت گرا جب مسلمان کمزور ہو گئے، اختلافات میں بٹ گئے، ذاتی مفادات نے امت کے اجتماعی مصالح کی جگہ لے لی اور ہر فریق صرف اپنے اقتدار، اپنے اثر و رسوخ اور اپنی کرسی کے تحفظ میں مصروف ہو گیا۔

آج جب انسان غزہ کی طرف دیکھتا ہے، محاصرہ، بھوک، بمباری، بچوں کی چیخیں، ماؤں کے آنسو اور امت کی خاموشی دیکھتا ہے تو اسے غرناطہ کے آخری دن یاد آجاتے ہیں۔ وہی حالات، وہی درد اور وہی تاریخ کا دہرانا۔ وہاں بھی مسلمان تنہا چھوڑ دیے گئے تھے اور آج غزہ بھی ظلم، دشمن کے اتحاد اور امت کی بے بسی کے درمیان کھڑی ہے۔

غرناطہ کے لوگ جانتے تھے کہ ان کے پیچھے کوئی بڑی طاقت موجود نہیں، اسی لیے انہوں نے اپنے ایمان، جہاد، قربانی اور استقامت پر بھروسہ کیا تھا۔ غزہ بھی آج اسی جذبے کے ساتھ کھڑی ہے۔ وہ بچے جو بمباری کے سائے میں قرآن حفظ کر رہے ہیں، وہ مائیں جو اپنے شہید بیٹوں کو فخر کے ساتھ رخصت کرتی ہیں اور وہ مجاہدین جو دنیا کے جدید ترین ہتھیاروں کے سامنے اب بھی ثابت قدم ہیں، یہ سب اسلامی عقیدے کی حیاتِ نو کی نشانیاں ہیں۔

لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ چند جانبازوں کی قربانیاں اس وقت تک امت کو نہیں بچا سکتیں جب تک پوری امت بیدار نہ ہو۔ غرناطہ اندرونی اختلافات، نسلی تعصبات، اقتدار کی کشمکش اور کمزور قیادت کی وجہ سے سقوط کا شکار ہوا۔ آج بھی اگر امت زبان، نسل، سیاست اور جماعتوں کے نام پر تقسیم رہی تو غزہ کا درد صرف غزہ کی دیواروں تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ یہ آگ پوری امت کے دروازوں تک پہنچ جائے گی۔

غزہ آج امت کے لیے ایک آئینہ ہے۔ ہر شخص کو اس میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے۔ جو مظلوموں کا ساتھ نہیں دیتے، جو امت کے درد کو صرف خبروں کی سرخیوں تک محدود سمجھتے ہیں اور جو مسلمانوں کے خون کے عادی ہو چکے ہیں، انہیں غرناطہ کا آخری منظر یاد رکھنا چاہیے، وہ دن جب آخری بادشاہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر رو رہا تھا، لیکن اس کی گریہ وزاری کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔

امت کو سمجھنا چاہیے کہ تاریخ صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر ہم غرناطہ کے سقوط سے سبق نہ سیکھیں، اگر غزہ کی مزاحمت سے تنبیہ حاصل نہ کریں اور اگر دشمن کے اتحاد کے مقابلے میں اپنے اختلافات ختم نہ کریں، تو آنے والی نسلیں ہمارے بارے میں بھی یہی جملہ دہرائیں گی:

"تم اس امت پر روؤ جس کی حفاظت کے لیے تم مردوں کی طرح کھڑے نہ ہو سکے۔"

عزالدین حداد کے لہو کا قرض اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داری!

سیف اجمل

تاریخ کے اوراق ہمیشہ اُن بہادروں کے خون سے رنگین رہے ہیں جنھوں نے اپنے وطن، اپنے عقیدے اور اپنی عزت و ناموس کے دفاع کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ فلسطین کی پاک سرزمین پر حماس کی اسلامی تحریک کی عسکری قیادت کے جانبازوں کی شہادتیں اسی درخشاں تاریخ کی زندہ مثالیں ہیں۔ قائدین سے لے کر کارکنوں تک، غزہ کے شمالی محاذ کے محافظ اور مدبر عزالدین حداد تقبّلہ اللہ تعالیٰ صرف پہلے کمانڈر نہیں جو جامِ شہادت نوش کر گئے، بلکہ اُن سے پہلے بھی اُن کے رفقاء یکے بعد دیگرے اس عظیم مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں۔

ان مردانِ حق نے ایسی بے مثال قربانیاں پیش کیں جو مسلم امت کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ ہم دل کی گہرائیوں سے اُنہیں شہادت کی مبارکباد پیش کرتے ہیں؛ انہوں نے اپنے عزم و ہمت سے دنیا کو دکھا دیا کہ ایمان اور ارادہ ہر مادی طاقت سے برتر ہوتے ہیں۔ ان کے پاک خون کا ہر قطرہ آزادی کی صبح کا پیامبر ہے، اور ان کی یاد آنے والی نسلوں کے لیے مزاحمت کا روشن چراغ بن کر رہے گی۔

ان بہادروں کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں صہیونی غاصب اور جارح رجیم کی شکست نے اسے اس حد تک بے بس کر دیا کہ اس نے غزہ میں نہتے شہریوں، عورتوں اور بچوں پر اندھادھند بمباری شروع کر دی۔ اس مجرم رجیم نے جنگ کے تمام بین الاقوامی اور انسانی اصول پامال کر دیے ہیں۔ ہسپتالوں، اسکولوں، مساجد اور پناہ گزین کیمپوں پر حملے اس کی سفاکیت اور ناکامی کی کھلی علامت ہیں۔ یہ کوئی جنگ نہیں بلکہ ایک منظم نسل کشی ہے، جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ایک سیاہ داغ کے طور پر ثبت رہے گی۔ ہم ان بے رحمانہ اور انسانیت سوز حملوں کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔

لیکن سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس ہولناک ظلم کے مقابلے میں عالمِ اسلام کے اکثر حکمران اور عوام ایک مصلحت آمیز خاموشی اور کمزوری کا شکار ہیں، جو باعثِ ندامت ہے۔ عزالدین حداد تقبّلہ اللہ تعالیٰ کے لہو کا قرض ادا کرنا پوری امتِ مسلمہ کی ایک ناگزیر ذمہ داری ہے؛ آج ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان دنیا کے مختلف گوشوں میں موجود ہونے کے باوجود ذلت اور بے بسی کا شکار ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں نسلی، لسانی، علاقائی اور بے فائدہ فقہی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے امتِ واحدہ کے تصور کو فراموش کر دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی تمام تر توانائیاں مشترکہ دشمن کے مقابلے اور اپنے مقدسات کے تحفظ کے لیے صرف کریں، وہ باہمی نزاعات میں اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ یہی امت کی کمزوری کا سب سے بڑا پہلو ہے، جسے ہمیشہ اسلامی نظاموں کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

ایسے مایوس کن حالات میں امارتِ اسلامیہ افغانستان کی قیادت امتِ مسلمہ کے لیے امید کی کرن اور دردِ دل کا مظہر بن کر ابھری ہے۔ امارتِ اسلامیہ نے نہ صرف زبانی طور پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت کی ہے بلکہ عملی میدان میں بھی یہ ثابت کیا ہے کہ عالمی طاقتوں کے دباؤ کے باوجود وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے مالی اور جانی قربانی دینے کو تیار ہے۔

امارتِ اسلامیہ کی قیادت سیاسی تدبر، حکمت عملی اور عملی بصیرت کے ذریعے امتِ مسلمہ کی اس طوفان زدہ کشتی کو ساحلِ نجات تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی حکمتِ عملی درج ذیل اصولوں پر مبنی ہے:

- مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اتحاد کو فروغ دیں۔
- جذباتی ردِعمل سے گریز کرتے ہوئے حالات کے مطابق منظم اور حکیمانہ اقدامات کریں۔
- امت کے سیاسی اور عسکری استقلال کو دوبارہ بحال کریں۔

اسی مضبوط اور دانشمندانہ حکمت کے ذریعے امتِ مسلمہ حقیقی نجات حاصل کر سکتی ہے اور عالمی سطح پر اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ پا سکتی ہے۔

جہالت اور تکبر کا اتحاد: تہران سے کنڑ تک "علم کشی" کی مشترکہ حکمتِ عملی

سیف الدین

جب کسی وحشی رجیم کے جنگی طیارے عام شہریوں کے گھروں اور طلبہ کے تعلیمی مراکز کی مقدس دیواروں پر بم برساتے ہیں تو یہ محض ایک فوجی غلطی نہیں ہوتی، بلکہ یہ اُس صیہونی منصوبے کا حصہ ہوتا ہے جو مشرقِ وسطیٰ کے بیدار قوموں کے اذہان کو بارود کے ذریعے مفلوج کرنا چاہتا ہے۔ کنڑ پر پاکستانی رجیم کے حالیہ حملے، جن میں سید جمال الدین افغانی یونیورسٹی اور سرکانہ کا گاؤں خون میں نہلا دیے گئے، درحقیقت اُس "وحشیانہ آئینے" کی ایک جھلک ہیں جسے اسرائیل اور امریکہ خطے میں استعمال کر رہے ہیں۔

یہ بمباری بعینہٖ اُن جرائم کی نقل ہے جو کچھ عرصہ قبل ایران کے قلب (تہران) میں ایک طلبہ کے ایک تعلیمی مرکز کو نشانہ بنا کر کیے گئے تھے۔ وہاں بھی ہدف "علم" تھا اور یہاں بھی۔ اس قسم کی اشتعال انگیز کارروائیاں ظاہر کرتی ہیں کہ افغان طلبہ کی قاتل رکھ، کی سرشت اُن قابض قوتوں سے ملی ہوئی ہے جنھوں نے لبنان اور تہران میں یونیورسٹیوں اور لائبریریز کو نشانہ بنایا تاکہ آنے والی نسلوں کو ذلت کی تاریکی میں رکھا جائے۔ کنڑ یونیورسٹی پر حملہ اُس فکری جنگ کا تسلسل ہے جو افغان نوجوان کو کتاب سے دور اور لڑائیوں میں مصروف رکھنا چاہتی ہے۔

سرکانہ میں ایک پورے گاؤں کو نشانہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ حملہ آوروں کی منطق "اندھادھند قتل" پر مبنی ہے۔ یہی وہ درندگی ہے جو آج اسرائیل لبنان میں انجام دے رہا ہے، جہاں شہریوں کے مکانات جنگی طیاروں کی مشق گاہ بن چکے ہیں۔ جب کوئی رجیم اپنے ہم زبانوں اور ہمسایوں کے خلاف صیہونی حربے استعمال کرتی ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کی نام نہاد "اسٹریٹیجک ڈیپتھ" اب انسانی جانوں کے ضیاع اور آبادیوں کی تباہی تک محدود ہو چکی ہے۔

وہ رجیم جو یونیورسٹی کے ہاسٹل اور تدریسی کمروں پر بم برساتی ہے، درحقیقت اس نے سید جمال الدین افغانی کی اُس فکر کے سامنے شکست تسلیم کر لی ہے جو عالمِ اسلام کے اتحاد اور بیداری کی داعی تھی۔ یہ حملے صرف زمینی جارحیت نہیں بلکہ اُس مشترکہ تمدن پر حملہ ہیں جس کی بقا کے ضامن علم اور معرفت تھے۔

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ بارود کے دھوئیں میں علم کے چراغ بجھائے نہیں جا سکتے۔ اگر امریکہ تہران میں،

اسرائیل بیروت میں، اور پاکستان کی متجاوز رجیم کنڑ میں یونیورسٹیوں کو نشانہ بناتی ہے تو یہ اُن کے فکری دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ کنڑ یونیورسٹی کی ہر مسمار دیوار ایک ایسی بیداری کی بنیاد بنے گی جو حملہ آور رجیم کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

یونیورسٹی انسانیت کی بقا کا مرکز ہے، اور اس پر حملہ درحقیقت انسانی اقدار کو چیلنج کرنا ہے۔ ہمارے قلم جنگ اور وحشیانہ بمباری کے مقابلے میں انصاف اور روشنی کی تاریخی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔ کنڑ دنیا کے اُن تعلیمی مراکز کی نمائندگی کرتا ہے جو استعماری قوتوں کے حملوں کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے غیور عوام فوجی طاغوتی رجیم کی غلامی میں!

ذوالکفل ذکی

برصغیر میں اسلام کی آٹھ سو سالہ حکمرانی نے اپنی جڑیں لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں تک جمالی تھیں۔ برطانوی استعمار اور مسلمانوں کے زوال کے بعد بھی اس سرزمین میں بلند میناروں سے اذان کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ یہاں مسلمانوں کی نسلیں یکے بعد دیگرے آباد رہیں، برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمت اور آزادی کے حصول میں پیش پیش بھی یہی مومن قومیں تھیں۔

پاکستان کے قیام کی داستان محض ایک سیاسی واقعہ یا جغرافیائی تقسیم نہیں، بلکہ ایمان، فکر اور شناخت کی ایک گہری لہر تھی جو مسلمانوں کے دلوں میں اٹھی۔ اس مقدس تصور نے اسلامی اقدار، عقیدے کی وابستگی اور امت کے اتحاد کے خیال سے جنم لیا تھا۔ جب برصغیر کے مسلمان برطانوی ہند کی تقسیم کے دہانے پر کھڑے تھے، تو وہ صرف ایک محدود خطے کی علیحدگی نہیں چاہتے تھے، بلکہ ایک ایسے ملک کے خواہاں تھے جہاں اسلام کے پاکیزہ اصولوں کے مطابق زندگی بسر کی جائے، اسلام کو حاکمیت حاصل ہو اور ”لاإله إلا الله“ کے سائے تلے امن و سکون کی زندگی میسر ہو۔

اس تحریک کی اصل قوت ایک باہمت اور غیور مسلم عوام تھی۔ یہ وہ قوم تھی جو عقیدے کی روشنی میں بیدار ہو چکی تھی اور اپنے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے بے شمار قربانیاں دے چکی تھی۔ ان کا ایمان تھا کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو سیاست، معیشت اور زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ برصغیر کی وہ سرزمین جو ابھی حال ہی میں برطانوی استعمار سے آزاد ہوئی تھی، مسلمانوں کا یہ مسلمہ حق تھا کہ وہ اپنے دین، ثقافت اور تاریخ کے مطابق وہاں ایک آزاد نظام قائم کریں جہاں اسلام حاکم ہو اور وہ ایک اسلامی سرزمین پر زندگی گزار سکیں۔

اسی مقصد کے حصول کے لیے علمائے دین، فکری رہنما اور عام عوام سب نے مل کر جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے قرآن و سنت کی رہنمائی سے روشنی حاصل کی اور عدل و اخوت کی بنیاد پر ایک اسلامی معاشرے کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ پاکستان کے قیام کی بنیاد صرف سیاست نہیں تھی بلکہ اسلامی فکر، امت کے شعور اور ایک خودمختار

اسلامی نظام کے خواب میں پیوست تھی۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جہاں ایمان نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور عوام نے اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایک نئی مملکت کو جنم دیا۔
لیکن سب کچھ توقعات اور تصورات کے برعکس ہوا, اسلام اور شریعت کے نفاذ کے نعرے کے تحت قائم ہونے والا یہ ملک دوبارہ مغرب کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اسلامی شریعت کے بجائے مغرب کے وضع کردہ قوانین اور جمہوریت نافذ کی گئی، جبکہ سیکولرزم اور جمہوریت عوام پر مسلط کر دی گئی۔

ایک ایسا طبقہ اقتدار میں آیا جو مغربی مفادات کے لیے خود مغربیوں سے بھی بڑھ کر وفادار ثابت ہوا۔ جس دن سے اس فوجی رجیم نے اقتدار سنبھالا، اس نے اسلام، امت اور اپنے ہی عوام کے ساتھ دشمنی کا رویہ اختیار کیا، مغرب اور امریکہ کے منصوبوں کو آگے بڑھایا اور معمولی مادی فائدوں کے بدلے اپنے عوام اور اقدار کو فروخت کیا۔
اس کے امتیازی رویے نے قوموں اور طبقات کے درمیان گہرے اختلافات کو جنم دیا، یہاں تک کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ ایک قوم بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہے جبکہ دوسری آسودہ حال زندگی گزار رہی ہے۔ جب سے یہ طبقہ برسرِ اقتدار آیا ہے، بھاری ٹیکسوں اور قرضوں نے عوام کو شدید مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، جبکہ یہی حکمران ذاتی طیاروں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

اے پاکستان کے غیور عوام!

یہ وہی فوج اور طاغوتی عناصر ہیں جنھوں نے آپ کے سینکڑوں عرب مجاہد بھائیوں کو, جو اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے آئے تھے اور جنھوں نے اللہ کی مدد سے سوویت یونین کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا, دھوکے اور فریب سے امریکہ اور مغرب کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔
اسی فوج نے افغانستان کی جنگ میں عالمی افواج کو اپنی فضائی، زمینی اور بحری حدود استعمال کرنے کی اجازت دی، اور اسی سرزمین سے جنگیں لڑی گئیں۔ اسی طرح ایک مسلمان خاتون، ڈاکٹر عافیہ صدیقی، کئی سالوں سے قید میں ہیں اور ان کا معاملہ انسانی حقوق کے حوالے سے ہمیشہ موضوعِ بحث رہا ہے۔ اس رجیم نے ہزاروں نوجوانوں کو دہشت گردی کے نام پر لاپتہ کیا، لاکھوں خاندانوں کو بے گھر کیا، اور ماؤں اور بیویوں کو اپنے پیاروں کے انتظار میں چھوڑ دیا۔

اے مومن و غیور عوام!

اب وقت آچکا ہے کہ اپنے حالات پر غور کیا جائے، عدل، اتحاد اور اصلاح کے لیے شعوری اقدامات کیے جائیں، اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جائز راستے اختیار کیے جائیں۔

اے مسلمان بھائیو! انسان کو عزت، وقار اور انصاف کے لیے پیدا کیا گیا ہے، نہ کہ ظلم کے سائے تلے زندگی گزارنے کے لیے۔ آپ کا ضمیر، ایمان اور فطرت آپ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ حق کو پہچانیں، انصاف کا مطالبہ کریں اور اپنے انسانی وقار کا تحفظ کریں۔ جو شخص حق کا راستہ اختیار کرتا ہے، اگرچہ وہ کٹھن ہو، مگر اس کا انجام فتح، عزت اور سربلندی ہی ہوتا ہے۔

اسلام کی نظر میں معصوم عوام کا قتل!

مولوی عبد الجبار

اسلام کی آمد سے قبل دورِ جاہلیت میں عربوں کا معاشرہ مختلف قسم کے مسائل اور بڑے چیلنجز سے دوچار تھا، وہ انسانی کرامت کی قدر سے ناواقف تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد نے انہیں واضح کر دیا کہ اسلام رحمت، عدل اور انسانی وقار کا دین ہے۔ اسلام میں انسانی جان کو بہت بلند مقام حاصل ہے، یہاں تک کہ ایک انسان کا ناحق قتل پورے انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے بے گناہ اور عام لوگوں کا قتل نہ صرف ایک بڑا اخلاقی جرم ہے بلکہ شرعی لحاظ سے بھی کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

اسی سلسلے میں قرآنِ کریم کی چند نصوص پیش کی جاتی ہیں، تاکہ انسانی جان کی قدر و قیمت کو سمجھا جا سکے اور یہ معلوم ہو کہ قرآن نے واضح طور پر ناحق قتل کی حرمت بیان کی ہے:

1. اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{مَن قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ أَوۡ فَسَادٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ ٱلنَّاسَ جَمِيعًا وَمَنۡ أَحۡيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحۡيَا ٱلنَّاسَ جَمِيعًا}

[المائدۃ: ۳۲]

ترجمہ: "اور جو کوئی کسی کو قتل کرے، جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے ہو، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی ایک کو زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دی۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ایک بے گناہ انسان کا قتل اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ناحق قتل کے دنیاوی اور اخروی نقصانات بہت زیادہ ہیں اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ قاتل خود بھی بعد میں شدید ندامت اور پشیمانی کا شکار ہوتا ہے۔ ناحق خون بہانے سے انسان مزید جرأت پکڑ لیتا ہے، یوں ہر قاتل گویا بدامنی کی بنیاد رکھتا ہے اور عمومی فساد کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

2. اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{وَمَن يَقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ جَهَنَّمُ خَٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا عَظِيمًا} [النساء: ۹۳]

ترجمہ: اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا، اور اللہ نے اس پر لعنت کی ہے، اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہ آیت قصداً قتل کرنے والے کے لیے سخت اخروی عذاب کو بیان کرتی ہے، جو اس جرم کی سنگینی کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر قتل کرے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، تو ایسے شخص کے لیے آخرت میں جہنم، لعنت اور بڑا عذاب ہے، اور وہ محض کفارہ ادا کرنے سے بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: اس حکم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ایسے ظالمانہ اعمال میں معاونت کرتے ہیں، یا ان کے جواز کے فتوے دیتے ہیں، یا ان ناحق قتلوں کو "جہاد" اور "ثواب" کا نام دیتے ہیں۔

❸ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ} [ہود: ۱۸]

ترجمہ: سن لو! کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ بے گناہ لوگوں کا قتل صریح ظلم ہے، اور اسلام ظلم کو سختی سے رد کرتا ہے اور ظالم کو ملعون قرار دیتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں بھی بے گناہ انسان، خصوصاً مظلوم مسلمان کے قتل کی حرمت بیان کی گئی ہے اور امت کو اس سے منع کیا گیا ہے:

1/ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ یَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللَّهِ، إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: النَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالْمَارِقُ مِنَ الدِّينِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ)

راوی: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

(بخاری: ۶۸۷۸، مسلم: ۱۶۷۶)

ترجمہ: کسی ایسے مسلمان شخص کا خون حلال نہیں جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، مگر تین صورتوں میں: جان کے بدلے جان، شادی شدہ زانی، اور وہ شخص جو دین سے نکل جائے اور مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ دے۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ان تین صورتوں کے علاوہ کسی انسان کا قتل ہر حال میں حرام ہے۔

2/ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(كان رسولُ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّم إذا بعَث سَريَّةً قال اغزُوا بسمِ اللهِ وفي سبيلِ اللهِ فقاتِلوا مَن كفَر باللهِ لا تغُلُّوا ولا تغدِروا ولا تُمثِّلوا ولا تقتُلوا وليدًا ولا امرأةً ولا شيخًا)

راوی: عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

(المعجم الأوسط للطبرانی ۴/۲۶۸، مسند أحمد: ۲۷۲۸)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی لشکر بھیجتے تو فرماتے: اللہ کے نام سے اور اللہ کے راستے میں نکلو، اللہ کے ساتھ کفر کرنے والوں سے قتال کرو، خیانت نہ کرو، بد عہدی نہ کرو، لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور کسی بچے، عورت یا بوڑھے کو قتل نہ کرو۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں بھی بے گناہ لوگ محفوظ ہیں۔

3/ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(أولُ ما يحاسبُ عليهِ العبدُ الصلاةُ ، وإنَّ أولَ ما يُقضَى بين الناسِ في الدماءِ)

راوی: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

(بخاری: ۶۸۶۴، مسلم: ۱۶۷۸، نسائی: ۳۹۹۱)

ترجمہ: بندے سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا، اور لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون (قتل) کے معاملات میں فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ حدیث بھی ناحق قتل کی سنگینی کو ظاہر کرتی ہے۔

سلف صالحین کے اقوال بھی اس مسئلے کی شدت کو واضح کرتے ہیں:

1. عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول:

”إن من ورطات الأمور التي لا مخرج من وقع نفسه فيها: سفك الدم الحرام بغير حله“

ترجمہ: بے شک ان ہلاکت خیز کاموں میں سے جن میں انسان پھنس جائے تو پھر نکلنے کا راستہ نہیں پاتا، ناحق خون بہانا ہے۔

❷ معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”کل ذنب عسی اللہ أن یغفرہ إلا من مات مشرکا أو قتل مؤمنا متعمدا“

ترجمہ: ہر گناہ کی امید ہے کہ اللہ اسے معاف کر دے، سوائے اس کے جو شرک کی حالت میں مرے یا کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے۔

❸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”من أعان علی قتل مسلم بشطر کلمۃ لقي اللہ مکتوب بین عینیہ: آیس من رحمۃ اللہ“

ترجمہ: جو شخص کسی مسلمان کے قتل میں آدھے لفظ کے برابر بھی مدد کرے گا، وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا: ”اللہ کی رحمت سے ناامید“۔

❹ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا قول:

فی ”شطر کلمۃ“ ”ہو أن یقول: اقت“ یعنی لا یتم کلمۃ اقتل

ترجمہ: ”آدھے لفظ“ سے مراد یہ ہے کہ کوئی صرف ”اقت...“ کہے اور ”اقتل“ (قتل کرو) کا لفظ مکمل نہ کرے۔ پس دیکھو کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور کتنا بھاری جرم ہے۔

﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ [غافر: ۵۲]

ترجمہ: اس دن ظالموں کو ان کا عذر کوئی فائدہ نہیں دے گا، اور ان پر لعنت ہو گی اور ان کے لیے برا ٹھکانہ ہو گا۔

فائدہ: اس میں خاص طور پر وہ لوگ شامل ہیں جو بغیر علم کے فتوے دے کر بے گناہ مسلمانوں کے قتل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

❺ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لزوال الدنیا أہون علی اللہ من قتل مؤمن بغیر حق“

ترجمہ: اللہ کے نزدیک دنیا کا ختم ہو جانا اس سے زیادہ ہلکا ہے کہ کسی مؤمن کو ناحق قتل کیا جائے۔

اور روایت میں اضافہ ہے:

”ولو أن أہل سماواتہ وأہل أرضہ اشترکوا فی دم مؤمن لأدخلہم اللہ النار“

ترجمہ: اگر آسمانوں اور زمین والوں میں سے سب کسی ایک مؤمن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ ان سب کو جہنم میں داخل کر دے گا۔

6 امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وأما تحريم قتل النفس المعصومة فمما انعقد عليه إجماع المسلمين، وهو من أعظم المحرمات“

ترجمہ: بے گناہ جان کا قتل حرام ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے، اور یہ بہت بڑے حرام کاموں میں سے ہے۔

ان تمام نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ بے گناہ انسان کا قتل اسلام میں انتہائی سنگین جرم ہے۔ حتیٰ کہ اس میں معمولی سی مدد یا اشارہ بھی سخت عذاب کا سبب بن سکتا ہے۔

لہذا ضروری ہے کہ لوگ ان تعلیمات سے سبق حاصل کریں، انسانی جان کی حرمت کو سمجھیں، اور کسی بھی صورت میں ناحق قتل کی حمایت نہ کریں اور نہ ہی اس کے لیے راستہ ہموار کریں۔ ساتھ ہی بااثر لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں کا راستہ روکیں جو دین کے نام پر بے گناہ انسانوں کے قتل کو جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ اللہ کے ہاں نہایت سخت مواخذے کا باعث بنے گا۔

پانچویں فصل

سیاسی مضامین

مکہ دفاعی معاہدہ: تزویراتی حقیقت، کاغذی بازدار قوت اور بدلتے ہوئے علاقائی مہرے!

احمد شفیق

مکہ مکرمہ کے قصر الصفا میں جب سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان، ترک صدر رجب طیب ایردوان اور پاکستان کے وزیرِ اعظم شہباز شریف نے 'مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے' پر دستخط کیے تو عالمی سیاست کے پنڈتوں نے اسے مشرقِ وسطیٰ کے لیے ایک نیا 'نیٹو' (NATO) قرار دے دیا۔ اس معاہدے کی سب سے گونج دار شق نیٹو کے آرٹیکل 5 کی طرح یہ ہے کہ:

'تینوں میں سے کسی ایک ملک پر حملہ، سب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔'

بظاہر یہ ایک ایسا فولادی اتحاد نظر آتا ہے، جو خطے میں طاقت کا توازن بدل کر رکھ دے گا، لیکن جب ہم بین الاقوامی تعلقات کی بساط پر پھیلے مہروں کا گہرا جائزہ لیتے ہیں تو اس چمک دار معاہدے کے پیچھے کئی تزویراتی مجبوریاں، نفسیاتی چالیں اور کڑوے حقائق نظر آتے ہیں۔

اس معاہدے کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے خطے کی روایتی دشمنی یعنی سعودی عرب اور ایران کے تناظر کو دیکھنا ہوگا۔ اگرچہ سفارتی زبان میں یہ بار بار دہرایا گیا کہ 'یہ اتحاد کسی مخصوص ملک کے خلاف نہیں ہے'، لیکن حقیقت یہی ہے کہ سعودی عرب کو طویل عرصے سے ایران کے میزائلوں، ڈرونز اور اس کی یمن کے حوثی یا عراق کی ملیشیا جیسی حامی علاقائی پراکسیز سے سیکیورٹی کے شدید خطرات لاحق رہے ہیں۔

یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان پہلے ہی سے ایک مضبوط دفاعی معاہدہ موجود تھا، جس کے تحت ہزاروں پاکستانی فوجی اور اینٹی میزائل سسٹم سعودی زمین پر تعینات ہیں تو پھر سعودی عرب کو اس نئے اتحاد میں ترکیہ کو شامل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کا جواب پاکستان کی عسکری اور معاشی حدود میں چھپا ہوا ہے۔ سفارتی اصطلاحات سے ہٹ کر اگر سچ بات کی جائے تو پاکستان تنہا ایران کے خلاف ایک مکمل بازدار قوت (Deterrence) پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان ایک ایٹمی طاقت ضرور ہے، لیکن اس کا ایٹمی پروگرام صرف اور صرف بھارت کے روایتی خطرے کو روکنے کے لیے مخصوص ہے۔ پاکستان اپنے جوہری ہتھیار کبھی کسی دوسرے ملک کے دفاع کے لیے

منتقل نہیں کر سکتا۔
دوسری طرف پاکستان اس وقت تاریخ کے بدترین معاشی بحران، قرضوں کے بوجھ اور ملک کے اندر ٹی ٹی پی اور بلوچستان کی علیحدگی پسند تحریکوں جیسے شدید اندرونی سکیورٹی چیلنجز سے نبرد آزما ہے۔ جب کوئی ملک اپنے بجٹ کے لیے خود خلیجی مما لک کا محتاج ہو اور اس کا اپنا گھر اندرونی خلفشار کا شکار ہو تو سرحد پار کسی دوسری جنگ میں کودنے کی اُس کی عسکری دھمکی میں وہ وزن باقی نہیں رہتا۔
ایران یہ بات اچھی طرح جانتا تھا، اس لیے پاکستان کی روایتی دفاعی چھتری سعودی عرب کو وہ نفسیاتی تحفظ نہیں دے پا رہی تھی، جس کی اسے ضرورت تھی۔
اسی تزویراتی خلا کو پُر کرنے کے لیے ترکیہ کو اس کھیل میں شامل کیا گیا۔ ترکیہ کی شمولیت کا مقصد پاکستان کی ناکامی کو سہارا دینا اور سعودی عرب کی دفاعی حکمتِ عملی کو 'دگنا' کرنا تھا۔
ترکیہ کے پاس نیٹو کی دوسری سب سے بڑی فوج اور دنیا کی 'بایراکتار' جیسی بہترین ڈرون ٹیکنالوجی موجود ہے۔ سعودی عرب اب مشرقِ وسطیٰ میں سکیورٹی کے لیے صرف امریکا پر انحصار نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ امریکا ایران جنگ کے دوران امریکی دفاعی چھتری سعودی عرب کو کیا تحفظ فراہم کرتی، بجائے خود امریکی موجودگی ہی سعودیہ پر ایرانی حملوں کا سبب بن گئی ہے۔
چناں چہ سعودی عرب نے پاکستان کی نام نہاد پیشہ ور فوج اور ترکیہ کی جدید ترین عسکری صنعت کو ملا کر ایک مبینہ خود مختار بلاک بنایا ہے۔ یہاں ترکیہ کا کردار ایران پر بمباری کرنا نہیں، بلکہ سعودی عرب کو ٹیکنالوجی کی ایک ایسی مضبوط ڈھال فراہم کرنا ہے، جس سے ایرانی حملے ناکام ہو جائیں۔
لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ معاہدہ واقعی ایک حقیقی عسکری اتحاد ثابت ہو گا یا یہ صرف کاغذ پر لکھی ایک خوب صورت تحریر رہے گا؟
فرض کریں کہ ایران، سعودی عرب میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بناتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ اس نے سعودی عرب پر نہیں، بلکہ اپنے دشمن امریکا پر حملہ کیا ہے۔ اب بالواسطہ طور پر یہ حملہ سعودی خود مختاری پر بھی ہو گا۔ ایسی صورت میں کیا پاکستان اور ترکیہ ایران کے خلاف جوابی فوجی کارروائی کریں گے؟
اس کا حقیقت پسندانہ جواب ہے کہ 'ہرگز نہیں...!'
کیوں کہ اگر پاکستان اور ترکیہ نے ایران کے خلاف محاذ کھولا تو وہ اپنی اب تک کی قائم سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیں گے۔ ایران کے پاس ترکیہ اور پاکستان کو زک پہنچانے کے لیے پراکسیز کا ایک پورا جال موجود ہے۔ ایران ردِ عمل میں

ترکیہ کے خلاف کرد علیحدگی پسندوں (PKK/YPG) کو جدید ہتھیار اور فنڈز فراہم کر کے ترکیہ کے اندر دہشت گردی کی نئی لہر شروع کرواسکتا ہے یا عراق اور شام میں موجود ترک فوج کو نشانہ بنواسکتا ہے۔ اسی طرح وہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں علیحدگی پسند نیٹ ورکس کو متحرک کر کے پاکستان کے لیے بھی شدید مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔

چوں کہ پاکستان اور ترکیہ کا ایران کے ساتھ کوئی ایسا مذہبی یا سیاسی تنازع نہیں ہے... جیسا سعودی عرب کے حوالے سے ہے، اس لیے وہ کبھی بھی ایران کے ساتھ براہِ راست جنگ کی قیمت نہیں چکائیں گے۔ ترکیہ نے تو امریکا ایران جنگ کے دوران بھی اپنی فضائی حدود ایران کے خلاف استعمال کرنے سے صاف انکار کر کے اپنی غیر جانب داری ثابت کی تھی۔

اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ معاہدہ عسکری سے زیادہ ایک 'نفسیاتی اور سفارتی ہتھیار' ہے... جس کا اصل مقصد جنگ لڑنا نہیں، بلکہ ایران کے سامنے ایک ایسا بھاری بھر کم بلاک کھڑا کرنا ہے، جس کی مجموعی طاقت دیکھ کر ایران کسی بڑی عسکری مہم جوئی سے باز رہے، جسے دفاعی زبان میں کاؤنٹر بیلنسنگ کہتے ہیں۔

اب معاملہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کل کو ایران کی طرف سے سعودیہ پر حملہ ہو جاتا ہے اور پاکستان و ترکیہ اپنی سلامتی کے ڈر سے ایران کے خلاف بمباری نہیں کرتے تو اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ 'مکہ معاہدے' کی کاغذی ساکھ اُسی وقت ختم ہو جائے گی۔

تاہم پاکستان اور ترکیہ اپنی معاہدہ جاتی ساکھ کے تناظر میں خاموش نہیں بیٹھنا چاہیں گے۔ وہ تہران پر بم گرانے کے بجائے سعودی عرب کو اینٹی میزائل سسٹم، ڈرون اور انٹیلی جنس ڈیٹا فراہم کر سکتے ہیں، تاکہ معاہدے کا بھرم بھی رہ جائے اور ایران سے براہِ راست دشمنی بھی نہ ہو۔

ہاں اس پورے منظر نامے میں پاکستان کے لیے ایک پوزیشن بالکل بظاہر واضح ہے کہ پاکستان کی دفاعی پالیسی کا ایک کارڈ یہ ہے کہ 'اگر حرمین شریفین کی جغرافیائی حدود کو کوئی براہِ راست خطرہ لاحق ہوا تو پاکستانی فوج تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہر صورت دفاع کرے گی۔'

لیکن بات یہ ہے کہ سعودیہ مخالف کوئی ملک آج کی دنیا میں حرمین شریفین پر حملہ کر کے اپنی ساکھ کیوں خراب کرے گا اور کیوں وہ اپنے لیے جنگ کے نئے محاذ کھولے گا؟ یہ وہ نکتہ ہے، جو پاکستان کے 'دفاعِ حرمین کے معاہدہ جاتی کارڈ' کی حقیقت کھول کر رکھ دیتی ہے، جس کا بظاہر مقصد یہ نظر آتا ہے کہ پاکستانی فوج معاہدے کے اس شق کے ذریعے پاکستانی عوام کے سامنے خود کو مکہ و مدینہ اور ان کی تعلیم و فکر سے وفادار ثابت کرنے کا کارڈ کھیلتی ہے۔

پاکستانی فوج کی تزویراتی مصلحت اور تاریخ کے خونی موڑ: بلیک ستمبر سے عصرِ حاضر تک

اکبر جمال

سیاسی تاریخ کا ایک تلخ ترین المیہ یہ ہے کہ طاقت کے ایوانوں میں اخلاقی جرائم اکثر تزویراتی تمغوں میں بدل دیے جاتے ہیں اور جو قدم قانون کی کتابوں میں سخت ترین سزا کا حق دار ہوتا ہے، وہ اسٹیبلشمنٹ کے شطرنج پر ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔

جب ہم ستمبر 1970ء میں اُردن کی دھرتی پر لڑی جانے والی خون ریز خانہ جنگی یعنی 'بلیک ستمبر' کے اوراق پلٹتے اور اس کا موازنہ معاصر پاکستانی تزویراتی منظر نامے سے کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسا غیر تحریری ضابطہ اور تسلسل نظر آتا ہے، جہاں 'ریاست کی رٹ' اور 'ادارہ جاتی تحفظ' کے نام پر فرد کے فیصلوں کو قانون سے بالاتر کر دیا جاتا ہے۔

یہ کہانی صرف ایک پچاس سال پرانے واقعے کی نہیں... بلکہ ایک مخصوص فوجی کلچر کی ہے، جو آج بھی اسی تال پر رقصاں ہے۔

اس داستان کا آغاز 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ سے ہوتا ہے... جہاں مصر، شام اور اردن کی افواج کو اسرائیل کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کوئی ناگہانی آفت نہیں تھی، بلکہ عرب حکمرانوں کی تزویراتی نااہلی، انٹیلی جنس کی فاش غفلت، باہمی بے اعتمادی اور قرآنی ہدایات کے برعکس عسکری تیاریوں کے فقدان کا منطقی نتیجہ تھا۔

اس جنگ کے نتیجے میں جب بیت المقدس اور مغربی کنارہ مسلم امہ کے ہاتھ سے نکل گئے تو لاکھوں فلسطینی اپنے ہی وطن میں دربدر ہو کر پناہ گزین کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

عرب حکومتوں کی اس تاریخی نااہلی نے فلسطینیوں کے اندر یہ شدید احساس پیدا کیا کہ 'اگر انہوں نے خود ہتھیار نہ اٹھائے تو ان کا وجود ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔'

یہی وہ مایوسی تھی، جس نے یاسر عرفات کی قیادت میں فلسطینی عسکریت پسند تنظیم (PLO) کو جنم دیا، جنہوں نے اردن کی سرزمین کو اسرائیل کے خلاف آخری مورچے کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردن کے اندر فلسطینیوں کی طرف سے غیر ارادی طور پر اسرائیل کے خلاف اپنی

عسکری سرگرمیوں کی وجہ سے 'ریاست کے اندر ریاست' قائم ہوتی دکھائی دینے لگی۔
وہ مبینہ طور پر اردنی قوانین کو خاطر میں نہ لاتے اور ان کے اقدامات کی وجہ سے اردن نے یہ سمجھ لیا کہ ان فلسطینیوں کی وجہ سے اُس کی اپنی خودمختاری داؤ پر لگ گئی ہے۔
ستمبر 1970ء کے اوائل میں جب ایک فلسطینی دھڑے PFLP نے کئی بین الاقوامی مسافر طیاروں کو ہائی جیک کر کے اردن کے صحرا میں اُتارا اور انہیں دھماکے سے اڑا دیا تو اُردنی شاہ حسین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
انہوں نے اسے اپنے تخت اور بقا کا چیلنج سمجھا اور فلسطینیوں کے خلاف ایک بھرپور اور بے رحمانہ فوجی آپریشن کا حکم دے دیا، جسے تاریخ 'بلیک ستمبر' کے نام سے یاد کرتی ہے۔
اس خونی موڑ پر بعد ازاں پاکستان کے صدر بننے والے ایک بریگیڈیئر محمد ضیاء الحق منظر نامے پر سامنے آئے۔
وہ 1967ء سے ایک باقاعدہ اور اعلانیہ سرکاری عسکری مشن کے تحت اردنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لیے وہاں تعینات تھے، جس کا مقصد 1967ء میں اسرائیل سے ہونے والی شکست کے بعد اردنی فوج کی تنظیمِ نَو اور گوریلا جنگ کی تربیت تھا۔
تاہم جب اردنی فوج اور پناہ گزین فلسطینیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو پاکستانی بریگیڈیئر ضیاء الحق نے رسمی بین الاقوامی قوانین اور حکومتِ پاکستان کے طے شدہ مینڈیٹ سے صریح تجاوز کرتے ہوئے اردنی فوج کی تزویراتی اور آپریشنل کمانڈ سنبھال لی۔
ضیاء الحق کے زیرِ نگرانی فلسطینی کیمپوں پر وحشیانہ بمباری اور فوجی کارروائی کی گئی، جس میں یاسر عرفات کے مطابق دس ہزار (10,000) سے پچیس ہزار (25,000) فلسطینی شہید ہوئے۔
یہ کارروائی اتنی شدید تھی کہ جب بریگیڈیئر ضیاء الحق پاکستان واپس پہنچے تو اس وقت کے کمانڈر اِن چیف جنرل گل حسن نے حکومت کی اجازت کے بغیر ایک دوسرے ملک کی داخلی جنگ میں حصہ لینے پر ضیاء الحق کے کورٹ مارشل کی سفارش کی...
مگر یہاں تاریخ نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ قانون کی نظر میں جس شخص کو سزا ملنی چاہیے تھی، شاہِ اردن کی ذاتی سفارش اور پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ کی مصلحت پسندانہ سوچ (Realpolitik) نے جنرل ضیاء الحق کے جرم کو ایک غیر معمولی عسکری اثاثہ قرار دے دیا۔
سزا کا وہ پروانہ پھاڑ دیا گیا اور یہ 'تزویراتی جرم' ضیاء الحق کی بے پناہ ترقی کا زینہ بن گیا، یہاں تک کہ 1976ء

میں پاکستانی وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سات سینئیر جنرلز کو بائی پاس کر کے ضیاء الحق کو آرمی چیف بنا دیا اور بھٹو مرحوم کا یہ ایک ایسا فیصلہ تھا، جو خود جنابِ بھٹو کی زندگی کی سب سے بڑی تزویراتی غلطی اور موت کے پھندے کا باعث ثابت ہوا۔

بریگیڈیئر ضیاء الحق کے کورٹ مارشل کا رُک جانا دراصل پاکستانی فوج میں اُس غیر تحریری قانون کی پہلی اینٹ تھی، جو بعد کی دہائیوں میں پاکستانی عسکری اسٹیبلشمنٹ کا مستقل تنظیمی کلچر بن گئی۔ اس کلچر کے تحت 'ادارہ جاتی یک جہتی' کو بیرونی احتساب پر ہمیشہ فوقیت دی جاتی ہے۔

جب تک کوئی اعلیٰ عسکری افسر ادارے کے بنیادی 'چین آف کمانڈ' کے دائرے میں رہتا ہے، اس کی تزویراتی غلطیوں، فاش ناکامیوں یا پالیسی کے تضادات پر عوامی سطح پر کارروائی نہیں کی جاتی، بلکہ انہیں 'وقت کی ضرورت' کہہ کر فائل بند کر دی جاتی ہے۔

اس تزویراتی کلچر اور پالیسیوں کے تضاد کی سب سے بہترین اور جدید ترین مثال ہیں لیفٹیننٹ جنرل (ر) فیض حمید اور موجودہ آرمی چیف جنرل عاصم منیر کی تزویراتی پالیسیوں میں نظر آتی ہے۔

ایک دور وہ تھا، جب جنرل فیض حمید ڈی جی آئی ایس آئی اور کور کمانڈر پشاور کی حیثیت سے کابل حکومت کے تعاون سے پاکستانی عسکری تنظیم ٹی ٹی پی (TTP) کے ساتھ مذاکرات اور مصالحت کی پالیسی چلا رہے تھے، جس کے تحت قیدی رہا ہوئے اور عسکریت پسندوں کو واپس آباد کیا گیا۔

تاہم جب کمانڈ تبدیل ہوئی تو جنرل عاصم منیر کی قیادت نے جنرل فیض کی پالیسی کو 180 ڈگری پر گھما کر اُسے ملک میں دہشت گردی کی نئی لہر کا باعث قرار دے دیا۔

تاہم تجزیہ کار جنرل عاصم منیر کی عسکریت پسندوں سے مذاکرات کے بجائے جنگ کی پالیسی کو پاکستانی فوج کی جانب سے روایتی طور پر 'جنگی معیشت' کے بقا کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو جنرل فیض حمید اور عمران خان کے اکٹھ سے ختم ہوتی دِکھائی دے رہی تھی۔

چناں چہ تجزیہ کاروں کے نزدیک 'وار اکانومی' کے تحفظ کی خاطر جنرل عاصم منیر کی قیادت میں عسکری اسٹیبلشمنٹ نے مذاکرات کی پالیسی کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے عسکریت پسندوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف زیرو ٹالرنس اور جنگ کا راستہ چنا۔

یہاں دل چسپ اور گہرا نکتہ یہ ہے کہ تزویراتی پالیسی کی اس فاش ناکامی اور تضاد پر عسکری قیادت نے کبھی عوام کو

جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

اسی تناظر میں جب جنرل فیض حمید کے خلاف آرمی ایکٹ کے تحت سنگین تادیبی کارروائی اور گرفتاری عمل میں آئی تو وہ ٹی ٹی پی سے مذاکرات کی تزویراتی ناکامی پر نہیں تھی، بلکہ ایک نجی ہاؤسنگ اسکینڈل (ٹاپ سٹی) میں اختیارات کے ناجائز استعمال اور ریٹائرمنٹ کے بعد سیاسی جوڑ توڑ میں ملوث ہونے کے الزامات پر ہوئی۔

پاکستانی فوج کا یہ عملی تضاد اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ میں سزا یا احتساب کی حدِ فاصل اُس وقت شروع ہوتی ہے، جب کوئی افسر فوجی تنظیمی ڈسپلن کو چیلنج کرے، ادارہ جاتی مجموعی مفادات کے متوازی اپنا کوئی انفرادی ایجنڈا چلانے لگے یا ریٹائرمنٹ کے بعد ریاستی پالیسی کے برعکس سیاسی عمل کا حصہ بن کر مقتدرہ کی روایتی لائن کو کراس کر جائے۔

البتہ جب تک کوئی بھی فوجی افسر فوج کے سیاست پر کنٹرول، وار اکانومی کے تحفظ، پارلیمنٹ کو ہائی جیک کرنے اور امریکی منصوبوں کی ضروری تکمیل جیسے مجموعی مفادات کی لکیر عبور نہیں ہوتی، تب تک بڑے سے بڑے فوجی افسر کا بڑے سے بڑا جرم بھی مصلحت کے پردوں میں چھپا رہتا ہے۔

بلکہ اب تو یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ اس جرم کو ہی تاحیات قانونی استثناء دے دیا جائے...

چناں چہ بلیک ستمبر 1970ء کے اُردن سے لے کر معاصر پاکستان کے تزویراتی فیصلوں تک کی تاریخ ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ جب ریاستیں اور مقتدرہ عوامی جوابدہی اور شفافیت کے بجائے ادارہ جاتی استثنا کو اپنا اصول بنا لیتی ہیں تو حق و باطل کی لکیریں دھندلی ہو جاتی ہیں۔

ایک عام شہری یا فلسطینیوں جیسے پناہ گزین کی نظر میں جو ان کے بنیادی حقوق اور بقا کی جنگ ہوتی ہے، اسٹیبلشمنٹ کے بیانیے (Narrative Building) میں اسے 'ریاست کی رٹ' یا 'داخلی فتنہ' قرار دے کر کچل دیا جاتا ہے۔ اگر زیادہ ضرورت محسوس ہو تو دربار سے منسلک علماء کو حاصل کر کے خوارج وغیرہ کے فتوے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

شاید یہ آئیڈیا جنرل ضیاء الحق کے پاس نہیں تھا، ورنہ وہ ریاستِ اُردن کے باغی ہونے کے ساتھ ساتھ خوارج بھی قرار دیے جا سکتے تھے...

طاقت کا یہ کھیل شاید عارضی طور پر سلطنتوں اور اداروں کو تو بچا لیتا ہو، لیکن تاریخ کے کٹہرے میں یہ سوال ہمیشہ قائم رہتا ہے کہ تزویراتی کامیابیوں کی قیمت آخر کب تک عام انسانوں کے خون اور دربدری سے چکائی جاتی رہے گی؟

وہ فوج جس کی اصل دشمنی مسلمانوں سے ہے!

سید جمال الدین

یہ واقعہ آج سے تقریباً آٹھ دہائیاں پہلے کا ہے، جب برطانوی افواج نے متحدہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ بھارت جبکہ دوسرا پاکستان اور بنگال کے نام سے موسوم ہوا۔ مسلم اکثریت والے علاقوں کے بارے میں فیصلہ یہ تھا کہ وہ پاکستان کے حوالے کیے جائیں گے، جن میں کشمیر بھی شامل تھا۔

لیکن جب دونوں فریق اپنی اپنی زمینوں کے حصول کے لیے آگے بڑھے اور سرحدوں کی تقسیم کا مسئلہ زیرِ بحث آیا، تو بھارت نے کھل کر کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کبھی بھی کشمیر پاکستان کو نہیں دے گا۔

یہ تنازعہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ کشمیر کا فیصلہ طاقت کے ذریعے ہوگا اور جنگ ہی آخری فیصلہ کرے گی۔ اسی بنا پر اس وقت پاکستان کے قائد محمد علی جناح نے فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو حکم دیا کہ کشمیر پر حملہ کرے اور فوج کو ہدایت دے کہ فوری جنگ کے ذریعے اس کا مستقبل طے کرے۔ مگر محمد علی جناح اس وقت حیران رہ گئے جب جنرل گریسی نے کھلے عام اس حکم کو مسترد کر دیا اور کہا کہ فوج ہرگز کشمیر کے محاذ پر نہیں جائے گی۔

جنرل گریسی چونکہ برطانوی فوج سے تعلق رکھتا تھا اور اس وقت پاکستان کے پاس کوئی منظم مسلم کمانڈر نہیں تھا، اس لیے فوج کی کمان بھی انہی برطانوی افسران کے پاس تھی۔ جنرل گریسی اسی سلسلے کا دوسرا سربراہ تھا جس نے پاکستانی فوج کی سربراہی سنبھالی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ جنرل گریسی نے پاکستان کے بانی اور اس وقت کے سب سے بڑے حاکم کا حکم کیوں نہیں مانا؟ اس بارے میں مختلف آراء موجود ہیں، مگر خود جنرل گریسی کے مطابق خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک بھارت کے ہندوؤں سے زیادہ پاکستان کو افغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی بڑھانی چاہیے۔ اسی لیے اس نے دلائل دے کر محمد علی جناح کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ یہ واضح نہیں کہ جناح نے یہ بات مانی یا نہیں، لیکن وہ بلاشبہ فوج کے سامنے کسی حد تک بے بس ضرور تھے۔

جنرل گریسی نے تین سال تک مسلسل پاکستانی فوج کی تربیت کی، اور اس دوران اس کی سب سے بڑی کوشش یہ رہی کہ فوجیوں کے دلوں میں افغان مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے۔ وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا اور پھر ریٹائر ہو گیا۔ برطانوی افواج، جو دنیا پر قبضہ کرنے نکلی تھیں اور کئی جگہ کامیاب بھی ہوئیں، افغانستان میں مسلسل شکستوں سے دوچار ہوئیں اور ذلت آمیز ناکامیاں اٹھائیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کئی بار برطانوی فوجیں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں اور ایک بھی زندہ نہ بچا جو واقعہ بیان کر سکے۔

اسی لیے یہ فطری بات تھی کہ برطانیہ افغانستان سے گہری دشمنی رکھتا تھا۔ اس دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے مختلف منصوبے اور خطرناک تدابیر اختیار کیں، جو تاریخ میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک اہم منصوبہ یہ تھا کہ پاکستانی فوج کو یہ باور کرایا جائے کہ اس کا ازلی دشمن بھارت نہیں بلکہ افغانستان کے مسلمان ہیں، تاکہ وہ ہمیشہ افغان مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے اور یہ دشمنی اس کی فطرت کا حصہ بن جائے۔

جنرل گریسی کی دی ہوئی تربیت اور ان کے دلوں میں کافروں اور مشرکوں کے مقابل مسلمانوں کے خلاف پیدا کی گئی نفرت اور گہرے بغض و دشمنی کا اظہار نہ صرف افغان مسلمانوں کے خلاف بلکہ پاکستان کے مظلوم مسلمانوں کے خلاف بھی شدت سے ہوا۔ کشمیر آج تک ہندوؤں سے آزاد نہ ہو سکا، لیکن قلات اور سوات جیسے مسلم ریاستوں پر، جن کے ساتھ محمد علی جناح کے معاہدے بھی تھے، اسی فوج نے حملے کیے۔ معاہدوں کو پیروں تلے روند ڈالا گیا اور بمباری کے ذریعے ہر اس شخص کو نشانہ بنایا گیا جو اپنے حق کا مطالبہ کرتا تھا یا اس فوج کو مسلمان بھائی سمجھتا تھا۔

قلات کے خان خاندان کو معافی کا لالچ دے کر پہاڑوں سے نیچے لایا گیا، مگر بعد میں ان کے ساتھ بدترین سلوک کیا گیا اور وعدوں کے خلاف انہیں اتنی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا کہ ایسا سلوک جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اس فوج کی فطرت میں چونکہ مسلمانوں کے خلاف دشمنی شامل تھی، اس لیے دنیا میں جہاں بھی موقع ملا، اس نے مسلمانوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کیا۔

فلسطین کے مظلوم مسلمان، جو اس فوج کو ایک طاقتور اسلامی فوج سمجھتے تھے، اسی کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے گئے۔ آج بھی بہت سے فلسطینی اپنے دل میں یہود کے ظلم سے بھی زیادہ اس غدار فوج کے حملوں کو یاد رکھتے ہیں۔

روس کے خلاف جنگ میں شامل عالمِ عرب سے آئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مجاہدین کو یقین تھا کہ اگر دنیا ان کا ساتھ چھوڑ دے تب بھی پاکستانی فوج ان کی مدد کرے گی۔ جب امریکہ نے بے جا ان عرب باشندوں سے دشمنی

کی اور دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے تو ان مجاہدین کی امیدیں پھر بھی اسی پاکستانی فوج سے وابستہ تھیں، لیکن وہ اس وقت حیران اور بے بس رہ گئے جب اسی فوج نے امریکی خواہش سے پہلے ہی ایک ایک کر کے انہیں نشانہ بنایا۔ کچھ کو شہید کر دیا اور کچھ کو زندہ گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا تاکہ مسلمان دشمنی کا واضح ثبوت پیش کر سکے۔

یہ مسلمان دشمنی، جو پہلے فطرت کا حصہ تھی، اب عادت بن چکی ہے۔ عرب، فلسطینی، بنگالی، برمی یا افغان، کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ یہاں تک کہ پھر اس نے اپنے ہی ملک کے مسلمانوں کی جانب اپنی توپوں کا رخ موڑ لیا۔ کراچی سے پشاور، کوئٹہ سے اسلام آباد تک، ہر جگہ اپنے مسلمان بھائیوں کو گرفتار کر کے ''اصل مسلمانوں'' کے نام پر امریکہ کے حوالے کر کے ایک طرف امریکہ سے ڈالر وصول کیے تو دوسری طرف اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالتے رہے۔

جب امریکہ کے حوالے کیے جانے والوں کی تعداد بڑھ گئی اور امریکہ نے مزید قیدی لینے سے انکار کیا تو اسی فوج نے اپنے ہی لوگوں کو نشانہ بنایا۔ بلوچستان کے لوگوں کو خون میں نہلا دیا، گھروں اور بستیوں کا محاصرہ ہوا، فضائی حملے کیے گئے اور بوڑھوں اور بچوں سمیت کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ پورے خیبر پختونخوا میں گھروں پر چھاپے مارے گئے اور ہر بار ظلم و بربریت کی نئی داستانیں رقم ہوئیں۔ سندھ، خاص طور پر کراچی میں، لوگوں کو مختلف الزامات جیسے ''القاعدہ'' اور ''لشکر جھنگوی'' سے تعلق کا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا، ہزاروں کو لاپتہ کیا گیا یا جیلوں میں اس طرح ڈالا گیا کہ ان کی زندگی جہنم بن کر رہ گئی۔

پنجاب میں پولیس کے ذریعے خفیہ قتل شروع ہوئے اور امت کے ہزاروں مسلمان نوجوانوں اور بزرگوں معاشرے کے مختلف طبقات کے ہزاروں افراد کو قتل کر کے ختم کر دیا گیا۔ وہ فوج جس کی تربیت مسلمانوں کے خون کی پیاس پر ہوئی ہو، آج تک اسی راستے پر چل رہی ہے۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ طویل عرصے سے اسے کوئی بہانہ نہیں مل پا رہا تھا۔

بالآخر جب یہود اور ان کے مغربی حامیوں نے فلسطینی مجاہدین کو کچلنے کا فیصلہ کیا تو اس فوج کی پرانی خواہش پوری ہوئی۔ پہلے تو اس نے خود کو ان کے سامنے پیش کیا کہ مسلمانوں کا خون بہانے کا مظاہرہ کر سکے لیکن چونکہ اس میں وقت لگ رہا تھا اس لیے دوسری راہ تلاش کی۔

اسی دوران امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے لیے بگرام اڈے اور افغانستان میں باقی رہ جانے والے ہتھیار اہم مسئلہ تھے، جس کے باعث اس فوج نے افغان مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کیں اور مختلف حملے شروع کر

دیے تاکہ اپنا مقصد واضح کر دے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اس سے بھی اس کی خون کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ آخر کار ایک حساس وقت کا انتخاب کیا۔ رمضان کا مہینہ چنا اور پھر اسی مہینے میں شب قدر کی مبارک راتوں کے قریب کا وقت منتخب کیا۔ اور ان راتوں میں سے ایک مخصوص رات کا انتخاب کیا اور کابل پر حملے کر دیے۔

ان حملوں میں ان بے گناہ اور بے بس لوگوں کو نشانہ بنایا گیا جنہوں نے طویل مشکلات کے بعد زندگی کی کچھ امید پائی تھی اور جن کا کسی سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔۔ رپورٹس کے مطابق ان واقعات میں بڑی تعداد میں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ حملے ایسے ہتھیاروں سے کیے گئے جنہوں نے ہر چیز کو آگ میں بھسم کر دیا، اور یہ آگ مزید خونریزی کو جنم دیتی ہے، یہی آگ مسلمان دشمنی کی حقیقت کو مزید واضح کرتی ہے، اور اسی کے ذریعے اس دشمن قوت کے دل ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے یہ بھیانک کام سرانجام دیا۔

جو لوگ ان واقعات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۸ مارچ کو پاکستان کے کچھ سیاسی تجزیہ نگاروں نے تاریخی اعتبار سے یہ بات واضح کی تھی کہ کئی دہائیاں قبل بھی یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ کابل ہمیشہ جلتا رہنا چاہیے۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

مگر یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ طاقت جس کے مزاج میں مسلمان دشمنی ہو جس کی بنیاد مسلمانوں کے خون پر قائم کی گئی ہو اور جس کی رگوں میں ظلم دوڑتا ہو، اس سے رحم کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جس نے نہ فلسطینیوں پر رحم کیا، نہ عرب مسلمانوں پر، نہ بلوچستان کے مسلمانوں کے خون کو پاک سمجھا اور نہ ہی پشتونوں، پنجابیوں اور سندھیوں کے ناحق قتل سے ہاتھ روکا۔

جو فوج بیس سال تک غیر ملکی افواج کو افغان مسلمانوں کے خلاف اڈے فراہم کرتی رہی اور ہزاروں حملوں میں شریک رہی، اس کے لیے یہ کوئی مشکل بات ہے کہ ایک ہی لمحے میں سینکڑوں افراد کو نشانہ بنادے؟

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا!

حالیہ بغاوت گزشتہ سات دہائیوں کے ظلم و جبر کا ردعمل ہے!

سلامت علی خان

گزشتہ روز بلوچستان کے مرکزی شہر کوئٹہ سمیت چند شہروں میں بلوچ علیحدگی پسندوں کی جانب سے اچانک غیر معمولی صورتحال پیدا ہوئی۔ سورج نکلتے ہی بلوچ علیحدگی پسندوں نے ان علاقوں کی اہم سڑکوں، سرکاری مراکز اور متعدد اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ سرکاری تنصیبات کو بھاری نقصان پہنچا اور علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ عملاً پورا علاقہ بلوچ علیحدگی پسندوں کے کنٹرول میں آچکا ہے۔

بلوچ علیحدگی پسندوں کے ایک رہنما بشیر زیب نے ایک ویڈیو پیغام میں، جس میں وہ موٹر سائیکل پر سوار دیگر مسلح افراد کے ساتھ نظر آئے، بلوچستان کے تمام عوام سے اپیل کی کہ وہ باہر نکلیں اور اس فوجی حکومت سے آزادی حاصل کریں۔ اس کشیدہ صورتحال میں دیگر کئی افراد نے بھی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عوامی اثاثوں پر ہاتھ صاف کیے، اور تاحال اطلاعات کے مطابق تین یا چار بینک مکمل طور پر لوٹ لیے گئے ہیں۔ تجزیہ کاروں کے مطابق طویل عرصے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ بلوچ علیحدگی پسند کھلے عام کوئٹہ جیسے بڑے شہر میں داخل ہوئے اور علانیہ اپنی مرضی کے اقدامات کر رہے ہیں، اور یہاں تک کہ بعض شہری، حکومتی تنقید کے باوجود، خوشی میں ان کی تصاویر بنا کر سوشل میڈیا پر شیئر کر رہے ہیں۔

اس سے پہلے بلوچ علیحدگی پسند محدود حملے کرتے اور مرکزی شہروں سے دور علاقوں میں سرگرمیاں دکھائی دیتی تھیں، لیکن اس بار انہوں نے وسیع پیمانے پر جارحانہ حملے کیے اور اپنی تحریک کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا ہے۔ ان وسیع اور جارحانہ حملوں کے جواب میں پاکستانی حکام ہمیشہ کی طرح کہتے ہیں کہ یہ دہشت گردانہ حملے ہیں اور بے گناہ شہری خطرے میں پڑ گئے ہیں، مگر تجزیہ کار اور بلوچستان کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے افراد کا ماننا ہے کہ یہ سب کچھ پاکستان کے طاقتور فوجی اور حکومتی نظام کے ظلم و ستم کے خلاف ردعمل ہے۔

حالیہ سال میں بلوچوں کی ایک نمایاں سیاسی شخصیت سردار اختر جان مینگل نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ بلوچ نوجوان اب اپنے بزرگوں کی بات سننے پر آمادہ نہیں رہے، اور اب ہمیں خود ان کی تحریک میں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا چاہیے۔ سردار کے اس بیان پر وائس آف امریکہ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اسلام آباد میں قائم صنوبر

انسٹیٹیوٹ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور تجزیہ کار قمر چیمہ نے کہا تھا کہ بلوچ علیحدگی پسندوں کے ساتھ قبائلی و سیاسی رہنماؤں کی ہمدردی، نوجوانوں اور خواتین کا یکجا ہو جانا ایک غیر معمولی اور حیران کن امر ہے، اور ان کے بقول اس کے پس منظر میں پاکستانی ریاستی اداروں کے مظالم اور بلوچ عوام کے حقوق کی مسلسل پامالی کار فرما ہے۔

بلوچ علیحدگی کی تاریخ پر نظر رکھنے والے مؤرخین کا کہنا ہے کہ بلوچوں اور پاکستانی ریاست کے درمیان کشیدہ تعلقات پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی وجود میں آگئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد اس وقت کی ریاستِ قلات کے سربراہ خان آف قلات نے پاکستان میں شمولیت کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ اگر پاکستانی فریق طاقت کا استعمال کرے گا تو اس کے خلاف مسلح مزاحمت کی جائے گی۔ خان آف قلات کی عمل داری میں کوئٹہ سے لے کر گوادر تک تمام بلوچ اکثریتی علاقے شامل تھے، جہاں اسلامی قانون کے مطابق نظامِ حکومت چلایا جارہا تھا۔

علاقائی سطح پر یہ ان چند خطوں میں سے ایک تھا جہاں عدالتی امور برصغیر کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے ایک شاگرد اور نامور عالمِ دین شیخ شمس الحق افغانی انجام دیتے تھے، مگر پاکستانی حکام نے ان تمام حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے طاقت کا راستہ اختیار کیا، بمباری اور دیگر مظالم ڈھائے، اور بالآخر بلوچ علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لے آئے۔ یوں خان آف قلات کی جانب سے اعلان کردہ مسلح بغاوت وقتی طور پر دبا دی گئی۔

تاہم جب ایوب خان کے دور میں فوجی بغاوت ہوئی تو خان آف قلات کے بعض رشتہ داروں نے اس کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا، جس کی قیادت نوروز خان کر رہے تھے۔ کئی برسوں کی مسلسل مزاحمت کے بعد ایوب خان کی جانب سے یہ پیش کش کی گئی کہ اگر نوروز خان ہتھیار ڈال دیں اور خود کو حکام کے حوالے کر دیں تو انہیں معافی دے دی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے لیے ایوب خان نے متعدد معزز شخصیات کو ضامن کے طور پر پیش کیا، جس کے نتیجے میں نوروز خان پہاڑوں سے اتر آئے اور گرفتاری دے دی۔ مگر پاکستانی حکام نے اپنی روایت کے مطابق بدعہدی کی اور بہت جلد نوروز خان اور ان کے بیٹے کو پھانسی دے کر، اپنے وعدوں کے برخلاف، بے دردی سے قتل کر دیا۔

اگرچہ نواب نوروز خان کے ناحق اور بدعہدی پر مبنی قتل کے بعد بلوچ علیحدگی کی وہ لہر بظاہر ختم ہو گئی تھی، مگر بہت جلد ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار میں ایک مرتبہ پھر پورا بلوچستان، خواہ وہ پہاڑی علاقہ ہو یا میدانی، حکومت اور فوج کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں بلوچ سیاست دانوں کی قیادت میں قائم صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا اور سردار عطاء اللہ مینگل سمیت تمام بلوچ سیاسی رہنماؤں کو قید میں ڈال دیا۔ اس کے

علاوہ بھٹو حکومت نے مری اور جاولان کے علاقوں پر شدید بمباری کی اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے طاقت اور دہشت کا سہارا لیا تاکہ بلوچ عوام کو تابع بنایا جا سکے۔ محققین کے مطابق بھٹو کے دور میں نہایت وحشیانہ بمباری کی گئی، جس میں بڑی تعداد میں مرد، بے گناہ بچے اور خواتین جاں بحق ہوئیں۔

ان اقدامات نے بلوچ اکثریتی علاقوں میں پاکستانی ریاست اور اس کے حکمرانوں کے خلاف نفرت کی ایک نئی لہر کو جنم دیا۔ علاقائی مبصرین کا کہنا ہے کہ اگرچہ بھٹو کے بمباری اور فوجی آپریشنز کو آج تقریباً پچاس برس بیت چکے ہیں، تاہم اب بھی اس خطے میں بے گناہ شہریوں کے ناحق قتل اور گھروں کی وسیع پیمانے پر تباہی کے آثار نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کے ان جابرانہ اقدامات نے ایک بار پھر بلوچ علیحدگی پسندوں کے لیے میدان ہموار کیا اور بابو شیر محمد مری اور میر ہزار خان کی قیادت میں مزاحمت کی ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ بابو شیر محمد، جو "شیر" کے نام سے معروف تھے، نے بڑے پیمانے پر جوابی حملے شروع کیے، مختلف علاقوں میں ریاستی عمل داری کو مفلوج کیا اور حکومتی اداروں کو بھاری نقصان پہنچایا۔

تاہم جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا اور پاکستان میں بھٹو حکومت کا خاتمہ ہو کر فوجی جنرل ضیاء الحق برسرِ اقتدار آئے، تو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں سوویت افواج بلوچوں کو اسلحہ فراہم نہ کریں اور انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال نہ کریں۔ اسی اندیشے کے تحت ضیاء الحق نے بلوچ قیادت سے رابطہ کیا اور "سب کچھ معاف" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے متعدد وعدوں کے ذریعے حالات کو وقتی طور پر پرسکون کر دیا۔ بلوچوں نے مسلح جدوجہد ترک کر کے سیاسی عمل کی راہ اختیار کی، مگر یہ عمل اس وقت ایک بار پھر سبوتاژ ہو گیا جب پاکستان کے فوجی آمر پرویز مشرف نے بلوچوں کے ایک سرکردہ رہنما اور علاقے کی ممتاز شخصیت نواب اکبر بگٹی کو نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔ مزید برآں، مشرف نے قوم سے خطاب میں اس قتل کو اپنی ایک بڑی کامیابی قرار دیا اور پورے بلوچ قوم کے لیے نہایت توہین آمیز اور حقارت آمیز الفاظ استعمال کیے۔

ان واقعات کے نتیجے میں بلوچوں نے ایک بار پھر اپنی تحریک کا اعلان کیا اور مختلف علاقوں میں کارروائیاں شروع کر دیں، یہاں تک کہ آج وہ باقاعدہ طور پر مرکز تک پہنچ چکے ہیں اور اسے اپنے کنٹرول میں لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

بلوچوں اور پاکستانی حکمرانوں کے درمیان جاری تنازع اور کشیدگی کے پسِ منظر میں کون سے عوامل کارفرما ہیں؟

اس حوالے سے امریکہ کے ایک نیم سرکاری ادارے لائنز انسٹی ٹیوٹ نے ایک مفصل مقالہ شائع کیا ہے، جس میں بلوچ علیحدگی کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان بنیادی اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادارے کے مطابق بلوچ مسئلے کی

اصل جڑان کے بنیادی حقوق کی پامالی ہے۔ مقالہ بتاتا ہے کہ پاکستان کا سونا، گیس، بجلی اور وہ تمام معدنی وسائل جن پر ملکی معیشت کا انحصار ہے، بلوچستان سے حاصل کیے جاتے ہیں، مگر افسوس ناک امر یہ ہے کہ انھی وسائل کے بدلے بلوچ عوام کو کسی قسم کی سہولت فراہم نہیں کی جاتی۔ ان کے وسائل دوسروں کے لیے خوش حالی اور آسائش کا ذریعہ بنتے ہیں، جبکہ خود بلوچ عوام آج بھی غربت اور محرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کی زمینیں بنجر، گھر کھنڈر، کمرے تاریک ہیں، اور گیس فراہم کرنے والے صوبے کے شہری خود سردی سے ٹھٹھرتے ہیں اور ایندھن کے لیے جھاڑیاں جمع کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی مجبوری انہیں اپنے حق کے حصول کے لیے ہر ممکن جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔

تاہم عالمی مبصرین کے نزدیک مسئلہ محض حقوق تک محدود نہیں۔ پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک پاکستانی حکمرانوں نے مسلسل کوشش کی ہے کہ بلوچ عوام کو ہر طرح کے جبر کے ذریعے دبایا جائے، ان کی نئی نسل کو تعلیم سے دور رکھا جائے، انہیں باہمی بدگمانیوں اور قبائلی تنازعات میں الجھائے رکھا جائے، صحت کے لحاظ سے کمزور کیا جائے، اور ایسے افراد کو ابھرنے نہ دیا جائے جو قیادت سنبھال سکیں یا اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے نواب اکبر بگٹی کو ظلم و جبر کے ساتھ قتل کیا، ایک ایسا واقعہ جس پر آج بھی پورا پاکستان حیرت زدہ ہے اور سیاست دانوں، علماء اور ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد اس قتل کی مذمت کرتے ہیں۔

گزشتہ بیس برسوں کے دوران پاکستانی حکمرانوں نے ہزاروں بلوچ شہریوں کو نہایت بے رحمی کے ساتھ ان کے گھروں سے اٹھایا، جن کا آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ان لاپتا افراد کے بارے میں معلومات کے لیے ماما قدیر سمیت کئی بلوچ شہریوں نے مہینوں بلکہ بعض نے برسوں تک احتجاجی دھرنے دیے، مگر نہ صرف ان کی آواز نہیں سنی گئی بلکہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو مزید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔

حکمرانوں نے دیگر علاقوں تک بھی جبر کا دائرہ پھیلا دیا، معصوم بلوچوں کے قتل اور تشدد میں اضافہ ہوا، اور بڑی تعداد میں افراد کو گھروں سے اٹھا کر وحشیانہ انداز میں غائب کر دیا گیا۔ نہ ان کے خلاف کسی عدالت نے حکم جاری کیا اور نہ ہی انہیں کسی عدالتی فورم پر پیش کیا گیا؛ وہ محض لاپتہ ہیں۔ ان کے اہلِ خانہ آج بھی صرف اتنا چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے پیاروں کے زندہ یا مردہ ہونے کی خبر مل جائے۔

اس سلسلے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے احکامات بھی حاصل کیے گئے، مگر وہ حکمران جو خود کو مطلق العنان فرعون

سمجھتے ہیں، انہوں نے انسانیت، اسلام اور بین الاقوامی اصولوں کے سراسر خلاف ان احکامات کو نظر انداز کر دیا۔ گزشتہ چار برسوں میں ماہ رنگ بلوچ نامی ایک نوجوان لڑکی نے لاپتہ افراد کے لیے آواز بلند کی اور قانونی طریقے سے اسلام آباد میں احتجاج کرنا چاہا، مگر حکام نے اجازت دینے کے بجائے اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لاپتہ کر دیا۔ جب بڑی تعداد میں بلوچ عوام ماہ رنگ بلوچ کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو حکمرانوں نے حق سننے کے بجائے خود حق مانگنے والی ماہ رنگ بلوچ کو بھی قید کر دیا، اور آج بھی وہ قید میں ہے۔

اگرچہ پاکستانی حکمران بلوچ علیحدگی پسندوں کی کارروائیوں کا الزام کبھی افغانستان، کبھی ایران اور کبھی بھارت پر عائد کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر پاکستان کے امن کو سبوتاژ کرنے کے الزامات لگاتے رہتے ہیں؛ جس کے نتیجے میں گزشتہ برس پاکستان اور ایران کے درمیان باہمی حملے بھی دیکھنے میں آئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ سات دہائیوں کے دوران پاکستانی حکمرانوں نے بلوچ عوام کو مسلسل ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، ان کے حقوق پامال کیے، اور اسلام، انسانیت اور عالمی اصولوں کی کھلی خلاف ورزی کی۔ حکمرانوں نے ہمیشہ طاقت کے زور پر بلوچوں کی آواز دبانے کی کوشش کی، مگر تاریخ کا سبق یہی ہے کہ حق کی آواز دباؤ سے خاموش نہیں ہوتی، بلکہ مزید طاقت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اربکیوں کے ذریعے قومی تنازعات کو ہوا دینے میں پاکستان کا کردار!

سلمان ترین

خطے میں پاکستانی فوجی رجیم کی پالیسیوں کے سب سے خطرناک اور بیک وقت سب سے پوشیدہ پہلوؤں میں سے ایک، پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان قومی دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اس پالیسی کو شر و فساد کے گروہوں، بالخصوص سابقہ اربکیوں، کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ بظاہر اسے مرکزی حکومت کے مخالفین کو قابو کرنے کے نام پر جواز فراہم کیا جا رہا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کا ایک منصوبہ ہے جو اس رجیم کے ساختی ظلم اور امتیازی پالیسیوں کے خلاف کھڑی ہے۔

پاکستانی فوجی رجیم اچھی طرح آگاہ ہے کہ اگر پشتون اور بلوچ مرکزی حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف متحد ہو جائیں تو اس ملک کا استحکام سنگین خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ رجیم کئی دہائیوں سے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی اپنائے ہوئے ہے اور اپنے کٹھ پتلی گروہوں کے ذریعے ان دو بڑی قوموں کے درمیان مصنوعی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کرتی ہے، تاکہ محروم علاقوں کے بنیادی مسائل کو قومی تنازعات کے نام پر چھپایا جا سکے اور اپنے ساختی ظلم اور امتیازی پالیسیوں کی ذمہ داری سے دامن بچایا جا سکے۔

پشتون اور بلوچ، جو خطے کی دو بڑی اور قدیم قومیں ہیں، تاریخ کے دوران نہ صرف ایک دوسرے کے دشمن نہیں رہے، بلکہ تاریخ کے بہت سے ادوار میں قدرتی اتحادیوں کے طور پر زندگی گزارتے رہے ہیں۔ قبائل کے درمیان شادیاں، اقتصادی لین دین اور مشترکہ لسانی و ثقافتی اقدار نے دونوں قوموں کے تعلقات کو اس قدر مضبوط کیا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی پیدا کرنے کی ہر کوشش خطے کی تاریخی اور سماجی حقیقتوں سے واضح تصادم رکھتی ہے۔

پشتونوں اور بلوچوں کی موجودہ ناراضی اور بے اطمینانی پاکستان کی مرکزی حکومت کی امتیازی پالیسیوں کا نتیجہ ہے، نہ کہ قومی اختلافات کا۔ اقتصادی حقوق سے محرومی، پسماندہ علاقوں میں بنیادی منصوبوں کا فقدان، سیاسی آزادیوں کو دبانا، اہم فیصلوں سے مقامی رہنماؤں اور اشرافیہ کو الگ رکھنا اور بلوچستان کی گیس و تیل، نیز پشتون علاقوں کے پانی اور دیگر قدرتی وسائل کا یک طرفہ استحصال وہ عوامل ہیں جنہوں نے دونوں قوموں کے درمیان پاکستانی فوجی رجیم کے

خلاف عوام کے غصے اور ناراضی کو جنم دیا ہے۔
یہ ناراضی ظلم کے خلاف ایک فطری اور جائز ردِ عمل ہے اور اسے کبھی قومی جنگ کے طور پر تعبیر نہیں کیا گیا اور نہ ہی کیا جائے گا؛ سوائے اس کے کہ دشمن اختلافات کو ہوا دے کر اس تاریخی حقیقت کو مسخ کریں۔ پاکستانی فوجی رجیم شر و فساد کے گروہوں، بالخصوص ان سابقہ اربکیوں کے ذریعے، جن کا اپنے ہی لوگوں کے خلاف جرائم کا ایک طویل ریکارڈ ہے، قومی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔
اس پالیسی پر عمل درآمد کا طریقہ یہ ہے کہ بلوچ آبادی والے علاقوں میں ان گروہوں سے وابستہ افراد بد امنی، چوری، اغوا اور تخریبی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستانی فوج کی مداخلت کے لیے ماحول فراہم کرے۔ اس کے بعد فوج اسی مداخلت کو دہشت گردوں کو کچلنے اور علاقے کو پاک کرنے کے بہانے عوام اور دنیا کے سامنے پیش کرے، حالانکہ دہشت گرد قرار دیے جانے والے بہت سے افراد یا تو انہی کٹھ پتلی گروہوں کے ارکان ہوں گے یا پھر وہ بے گناہ افراد جن پر ناحق الزام عائد کیا گیا ہو گا۔
پشتون علاقوں میں بھی یہی گروہ فوجی چوکیوں اور سرکاری تنصیبات پر حملے کریں گے اور یوں فوج کو پشتونوں کے خلاف وسیع فوجی کارروائیاں کرنے کا بہانہ فراہم کریں گے۔ ذرائع ابلاغ اور سیاسی سطح پر بھی پاکستان وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کے ذریعے ان بدامنیوں کو قومی تنازعات کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ تصور پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ گویا پشتون اور بلوچ ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور مرکزی حکومت ہی ان کے درمیان امن کی واحد ضامن ہے۔
اس پالیسی کا بنیادی مقصد مرکزی حکومت کے ساختی ظلم سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ اگر بلوچستان اور پشتون علاقوں کے مسائل کو قومی تنازعات کے نام سے متعارف کرایا جائے تو پھر کوئی مرکزی حکومت سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ یہی علاقے پاکستان کے سب سے محروم علاقے کیوں ہیں، ان کے قدرتی وسائل پنجاب اور سندھ کے مفاد میں کیوں لوٹے جا رہے ہیں اور فوج ترقی اور آبادکاری کے بجائے صرف فوجی جبر کو ترجیح کیوں دیتی ہے۔
لیکن یہ خطرناک کھیل نہ صرف پاکستان کے مسائل حل نہیں کر سکتا، بلکہ بد امنی کا دائرہ پورے خطے تک پھیلاتا ہے اور خود پاکستان کو بھی سنگین چیلنجز سے دوچار کرتا ہے۔ قومی تنازعات کے تصور کو پھیلانا خطے کے لوگوں کی تاریخی یادداشت کو نظر انداز کرتا ہے، کیونکہ پشتون اور بلوچ دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اصل دشمن کون ہے اور ان کٹھ پتلی گروہوں کی جانب سے کیا جانے والا ہر قسم کا تشدد پاکستان کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے، نہ کہ قومی اختلافات

اسی طرح، یہ پالیسی تشدد کے سلسلے کو مزید مضبوط کرتی ہے اور گروہوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتی ہے کہ طاقت اور تشدد ہی مسائل کے حل کا واحد راستہ ہے۔ جو گروہ آج پشتونوں اور بلوچوں کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں، ممکن ہے کل پاکستان کے اندرونی تنازعات کو بھی ہوا دیں۔ پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان قومی اختلاف کی دعویٰ، پاکستانی فوجی رجیم کی جانب سے اپنے ساختی ظلم کو جواز فراہم کرنے کے لیے گھڑا گیا ایک بڑا سیاسی جھوٹا دعویٰ ہے۔ پشتون اور بلوچ دونوں ایک ہی امتیازی پالیسی کے شکار ہیں اور ان کا اصل مسئلہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں، بلکہ پاکستان کی مرکزی حکومت اور اس کی جابرانہ پالیسیوں کے ساتھ ہے۔

امارت اسلامیہ نے اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ہمیشہ قوموں کے اتحاد اور خطے کے لوگوں کے درمیان ہم آہنگی پر زور دیا ہے اور کبھی اجازت نہیں دے گی کہ دشمنوں کی سازشیں قوموں کے درمیان تاریخی اور مضبوط تعلقات کو نقصان پہنچائیں۔ عوام کی بیداری، قوموں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی ایسی مذموم سازشوں کو ناکام بنانے کا سب سے مؤثر اور بنیادی راستہ ہے۔

پاکستان میں سی ٹی ڈی (CTD) کے خلاف سخت مؤقف رکھنے والے جج عبد الحکیم کاکڑ کا داعش کے ہاتھوں قتل: پس پردہ حقائق کیا ہیں؟

ڈاکٹر فرحان کاکڑ

بلوچستان کی تاریخ ہمیشہ پہاڑی اور دشوار گزار علاقوں، گہرے سیاسی رازوں اور خون سے لکھی گئی داستاوں کے ساتھ جڑی رہی ہے، لیکن گزشتہ دنوں ضلع مستونگ کے ولی خان بائی پاس کے علاقے میں پیش آنے والے ایک واقعے نے اس علاقے کی فوجی سیاست، جغرافیائی سیاسی تضادات اور جاری بیانیوں کی جنگ کو ایسے مرحلے تک پہنچا دیا ہے، جہاں دوست اور دشمن کے درمیان لکیریں دھندلی ہو گئی ہیں۔

ضلعی و سیشن عدالت کے جج عبد الحکیم کاکڑ کا قتل صرف ایک عدالتی شخصیت کا قتل نہیں، بلکہ اس گہرے بحران کی واضح علامت ہے جس میں بلوچستان کا پورا سکیورٹی اور سیاسی ڈھانچہ دن بہ دن ڈوبتا جا رہا ہے۔

اگر اس واقعے کے پس منظر، محرکات اور اس کے بعد سامنے آنے والے حقائق کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ایک ایسا حیران کن اور تضادات سے بھرا منظر سامنے آتا ہے جس سے پاکستان کے جاری مسائل اور بحرانوں کے بہت سے اسباب واضح ہوتے ہیں۔

اس کہانی کا آغاز کیچ (تربت) کی سیشن عدالت کے اس کمرۂ عدالت سے ہوتا ہے، جہاں جج عبد الحکیم کاکڑ نے آئین اور قانون کی حکمرانی کا پرچم بلند کیا، ایسا مؤقف جس کی بلوچستان جیسے ایک حساس اور خوف زدہ ماحول میں توقع بہت کم کی جاتی تھی۔ نومبر 2023ء میں انسدادِ دہشت گردی کے محکمے (CTD) نے دعویٰ کیا کہ اس نے تربت میں ایک جھڑپ کے دوران چار "دہشت گرد" ہلاک کیے، جن میں "بالاچ بلوچ" نامی ایک نوجوان بھی شامل تھا۔

اس نوجوان کے رشتہ داروں نے اس کی لاش سڑک پر رکھ کر دھرنا دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بالاچ کو مبینہ جھڑپ سے کئی دن پہلے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا؛ اس لیے یہ پولیس کی جھڑپ نہیں بلکہ ماورائے عدالت قتل تھا۔ جب یہ مقدمہ جج عبد الحکیم کاکڑ کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے بعض روایتی ججوں کی طرح سکیورٹی اداروں کے تحریری دعووں کو نظر انداز نہیں کیا اور بغیر تحقیق کے ان کی تصدیق اور دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

انہوں نے انسدادِ دہشت گردی کے محکمے (CTD) سے مبینہ "پولیس مقابلے" کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس اور دستاویزی شواہد طلب کیے۔ جب مذکورہ ادارہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ "یہ قتل قانون کے مطابق کیا گیا ہے" تو جج نے ایک دلیرانہ اور بے مثال قانونی قدم اٹھایا اور پولیس کو متعلقہ سی ٹی ڈی افسران کے خلاف قتل کی ایف آئی آر (FIR) درج کرنے کا حکم دیا۔

یہ ایسا فیصلہ تھا جس نے ایک طرف سیکیورٹی اداروں کو شدید دباؤ سے دوچار کیا، اور دوسری طرف جج عبد الحکیم کاکڑ ان لوگوں کے لیے، جو خود کو مظلوم سمجھتے تھے، انصاف کے مطالبے کی ایک قابلِ اعتماد آواز بن گئے۔

جج صاحب کا یہ قانونی مؤقف صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ جب بھی سیکیورٹی ادارے کسی مشتبہ شخص کی گرفتاری، حراست یا تلاشی کے لیے ان کی عدالت سے اجازت یا حکم طلب کرتے، جج عبد الحکیم کاکڑ قانون کی بنیاد پر ان کی درخواستوں کا جائزہ لیتے۔

وہ واضح الفاظ میں کہتے تھے: "عدالتیں اس لیے نہیں ہیں کہ کسی ادارے کے غیر قانونی اقدامات یا شواہد کی موجودگی کے بغیر شہریوں کو لاپتا کرنے کے لیے محض تصدیق کی مہر بن جائیں۔" ٹھوس شواہد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے کئی مرتبہ انسدادِ دہشت گردی کے محکمے (CTD) کی وارنٹ جاری کرنے کی درخواستیں مسترد کیں اور متعدد گرفتار افراد کی رہائی کا حکم دیا۔

اسی وجہ سے جج عبد الحکیم کاکڑ عملی طور پر بلوچستان میں سرگرم سیکیورٹی اداروں، بالخصوص انسدادِ دہشت گردی کے محکمے (CTD)، کے لیے ایک مستقل چیلنج بن گئے تھے؛ کیونکہ وہ ان کے ایسے اقدامات کے خلاف، جنہیں قانون کے دائرے سے باہر سمجھا جاتا تھا، ایک اہم قانونی رکاوٹ سمجھے جاتے تھے۔

اب اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیے، جو مستونگ کے پہاڑوں میں ہونے والی ایک الگ اور خونریز لڑائی سے جڑا ہوا ہے۔

ایک طویل عرصے سے بلوچستان میں ایک طرف بلوچ قوم پرست مسلح گروہ، جیسے بلوچ لبریشن آرمی (BLA)، سرگرم ہیں، اور دوسری طرف داعش خراسان (ISKP) بھی مختلف رپورٹس اور دعووں کے مطابق اس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

مارچ 2025ء میں بلوچ لبریشن آرمی نے دعویٰ کیا کہ اس نے مستونگ کے علاقے میں داعش کے ایک خفیہ تربیتی کیمپ پر حملہ کیا اور تیس سے زیادہ داعش کے جنگجوؤں کو ہلاک کیا۔ داعش نے بعد میں جون 2025ء میں

ایک ویڈیو جاری کر کے اس حملے کا ذکر کیا اور بلوچ لبریشن آرمی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اس خونریز جھڑپ کے بارے میں بلوچ لبریشن آرمی کا دعویٰ تھا کہ مستونگ میں داعش کے ارکان پاکستانی انٹیلی جنس اداروں کی ہدایت پر بلوچ جنگجوؤں کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں، تاکہ پاکستانی فوج ان کے خلاف ٹارگٹڈ آپریشنز کر سکے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب مستونگ میں بلوچ لبریشن آرمی نے داعش کو اتنا بھاری نقصان پہنچایا تو پاکستانی میڈیا میں اس واقعے کی کوریج تقریباً نظر نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت بلوچ لبریشن آرمی کو یہ امتیاز نہیں دینا چاہتی تھی کہ گویا وہ ایک بین الاقوامی دہشت گرد گروہ کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد، جب داعش نے بلوچ لبریشن آرمی کے خلاف انتقامی حملے شروع کیے تو پاکستانی حکومت کے حامی سوشل میڈیا کے متعدد اکاؤنٹس، یوٹیوبرز اور بعض تجزیہ کاروں نے ان حملوں کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے داعش کے ان حملوں کو بلوچ لبریشن آرمی کی کمزوری اور ریاست کی ایک بڑی کامیابی کے طور پر پیش کیا۔

یہیں پہلا بڑا اور حیران کن تضاد سامنے آتا ہے، جو پاکستانی فوج اور اس کے حامیوں کے بیانیے میں موجود تضادات کو ظاہر کرتا ہے۔ پاکستانی حکومت کے حامی حلقوں نے بلوچ لبریشن آرمی کی مخالفت کے جذبات میں یہ بات فراموش کر دی کہ پاکستان کا سرکاری مؤقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ملک میں داعش کی کوئی منظم موجودگی یا محفوظ ٹھکانے موجود نہیں ہیں۔ لیکن جب پاکستانی فوج کے حامی سوشل میڈیا اکاؤنٹس نے داعش کے حملوں کا خیر مقدم کرنا شروع کیا تو انہوں نے بالواسطہ طور پر یہ تاثر بھی دیا کہ گویا داعش پاکستان میں اتنی منظم اور طاقتور موجودگی رکھتی ہے کہ بلوچ لبریشن آرمی جیسے ایک بڑے مسلح گروہ کے نیٹ ورک کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

"دشمن کا دشمن دوست ہے" کے منطق کے مطابق ایک بین الاقوامی انتہاپسند گروہ کی فوجی کامیابیوں کا جشن منانا، سکیورٹی اداروں کے اس سرکاری بیانیے سے متصادم ہے جو وہ ایک طویل عرصے سے پیش کرتے آئے ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ روایتی مؤقف بھی سوالیہ نشان بن جاتا ہے جو پاکستان کی فوج کا شعبۂ تعلقاتِ عامہ (ISPR) ہمیشہ پیش کرتا رہا ہے؛ یعنی یہ کہ پاکستان کے خلاف تمام مسلح گروہوں، خواہ بلوچ ہوں یا مذہبی انتہاپسند، کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا خفیہ تفاہم اور ہم آہنگی موجود ہے۔

بلوچ لبریشن آرمی اور داعش کے درمیان خونریز جھڑپیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ دونوں کے درمیان نہ کوئی رسمی اور نہ ہی کوئی غیر رسمی معاہدہ ہے، بلکہ دونوں نظریاتی اور عسکری اعتبار سے ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ ریاست کی جانب سے تمام مسلح گروہوں کو یکساں طور پر پیش کرنا بین الاقوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ایک

پروپیگنڈا حکمتِ عملی تھی، تاکہ بلوچ تحریک کو داعش کے ساتھ جوڑا جائے، عالمی رائے میں اسے بدنام کیا جائے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ہونے والی تنقید کو کمزور کیا جائے۔ لیکن یہ تضادات اس وقت اپنے انتہائی حساس اور حیران کن مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں جب مستونگ میں جج عبدالحکیم کاکڑ قتل ہوتے ہیں اور داعش اس حملے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔

داعش کے اعلان کردہ مؤقف کے مطابق، یہ گروہ ان حکومتوں، افراد اور عدالتوں کا مخالف ہے جو جمہوریت اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور آئین کی بنیاد پر کام کرتی ہیں۔ جج عبدالحکیم کاکڑ بھی اسی جمہوری آئین کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے تھے، لہٰذا اس منطق کے مطابق وہ داعش کے ممکنہ اہداف میں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن قابلِ غور تضاد یہ ہے کہ یہی جج اسی وقت پاکستانی سکیورٹی اداروں کے ان اقدامات کی مخالفت کر رہے تھے جنہیں قانون کے دائرے سے باہر سمجھا جاتا تھا، اور ان کی پسند کے فیصلے جاری کرنے سے انکار کرتے تھے۔

جج کا یہ مؤقف بالواسطہ طور پر ان لوگوں کے لیے فائدہ مند تھا جو خود کو ریاستی دباؤ اور ظلم کا شکار سمجھتے تھے، اور اس سے قبل جج اور داعش کے درمیان کسی واضح ذاتی یا سابقہ اختلاف کا بھی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ پھر داعش نے ایسے جج کو کیوں نشانہ بنایا جس کا عدالتی مؤقف سکیورٹی اداروں کے لیے مسئلہ سمجھا جاتا تھا؟

یہی سوال اس بنیاد کی تشکیل کرتا ہے جس کی بنا پر بعض بلوچ سیاسی حلقے، آزاد تجزیہ کار اور میڈیا یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ داعش بلوچستان میں سکیورٹی اداروں کی ایک پراکسی تنظیم کے طور پر کام کر رہی ہے۔ جج عبدالحکیم کاکڑ کے قتل سے سب سے بڑا نقصان قانون کی حکمرانی اور انصاف کو پہنچا، لیکن ان کے مطابق سب سے زیادہ فائدہ ان سکیورٹی اداروں کو پہنچا جنہیں داعش اپنے اعلان کردہ نظریے کے مطابق اسلام کے دائرے سے باہر سمجھتی ہے، اور جج نے ان کے بعض اہلکاروں کے خلاف قانونی مقدمات درج کرنے کے احکامات جاری کیے تھے۔

اگر جج عبدالحکیم کاکڑ کے قتل کے بعد تمام شک اور عوام کا غصہ سکیورٹی اداروں کی طرف منتقل ہو جاتا تو داعش کی جانب سے فوری طور پر حملے کی ذمہ داری قبول کرنے سے بالواسطہ طور پر سی ٹی ڈی (CTD) اور پاکستانی فوج جیسے سکیورٹی اداروں پر موجود شکوک کم ہونے کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ ایک قابلِ غور تضاد ہے کہ ایک ایسا گروہ جو خود کو جمہوریت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہے، ایسا اقدام کرتا ہے جو عملی طور پر اسی جمہوری نظام کے سکیورٹی اداروں کے مفاد میں جاتا ہے اور ان کا مؤقف آسان بنا دیتا ہے۔

اس تمام صورتِ حال کا سب سے تلخ نتیجہ یہ ہے کہ بلوچستان میں جاری تنازع، جس میں داعش اور پاکستانی فوج و

سکیورٹی ادارے ایک فریق کے طور پر دکھائی دیتے ہیں، اب ایسے مرحلے تک پہنچ گیا ہے جہاں ریاست کے سرکاری بیانیوں کو سنجیدہ سوالات کا سامنا ہے۔

اگر پاکستانی سکیورٹی ادارے واقعی داعش کو اپنے تزویراتی مقاصد اور اپنے قلیل مدتی مخالفین، یعنی بلوچ قوم پرستوں، کو کچلنے کے لیے ایک پراکسی قوت کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو پھر یہ گروہ پاکستان میں کبھی ختم نہیں ہوگا۔

"دہشت گردی اس سانپ کی مانند ہے جسے انسان صرف اس لیے نہیں پال سکتا کہ وہ اس کے پڑوسی کو ڈسے؛ کیونکہ ایک دن یہی سانپ اپنے پالنے والے کو بھی ڈس لے گا۔"

جج عبدالحکیم کاکڑ کا قتل اسی پالیسی کی ایک مثال ہے، کیونکہ یہی پراکسی قوت بالآخر ریاست کے اس ستون پر حملہ آور ہوئی جسے عدلیہ کہا جاتا ہے۔ جب تک پاکستانی فوج اور سکیورٹی ادارے اپنے قانونی فرائض مکمل طور پر انجام نہیں دیتے، عوام کو حقیقی اثاثہ نہیں سمجھتے اور پروپیگنڈا ایجنٹوں کے ذریعے اپنے فاسد مقاصد کی پیروی کرتے ہیں، تب تک جج عبدالحکیم کاکڑ جیسے قانون اور عوام کے حامی افراد قربان ہوتے رہیں گے، اور سی ٹی ڈی (CTD) جیسے مجرم ادارے داعش کی جانب سے حملے کی ذمہ داری قبول کیے جانے کے پردے میں خود کو چھپانے کی ناکام کوشش جاری رکھیں گے۔

سی آئی اے افغانستان میں کیوں ناکام ہوئی؟ الجزیرہ کی خصوصی رپورٹ

لطف اللہ خیر خواہ

«کچھ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ امریکہ جو چاہے، وہ کر سکتا ہے؛ کیونکہ وہ چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اگر وہ کسی کام کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا اس کے وسائل کمزور ہوں، یا کسی انتظامی مسئلے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے، تو پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کام کرنا ہی نہیں تھا، اسی لیے نہیں کر سکے۔»

جنرل پیٹر چیاریلی نے یہ جملہ ایک ایسے مضمون میں لکھا تھا جو امریکی فوج کے عربی رسالے ''العرض العسکری'' کی جانب سے افغانستان اور عراق کی جنگوں کے دوران شائع ہوا تھا۔ یہ جملہ امریکہ کی وسیع طاقت کے بارے میں ان عام تصورات کی عکاسی کرتا ہے جو دنیا میں پائے جاتے ہیں، اور جب بڑے واقعات کے حوالے سے امریکی انٹیلی جنس کے اثر و رسوخ کی بات ہوتی ہے تو یہ تصورات مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف، جیسا کہ رابرٹ گریوز کی کتاب ''انٹیلی جنس کیوں ناکام ہوتی ہے؟ ایران کے انقلاب اور عراق کی جنگ سے حاصل ہونے والے اسباق'' میں پڑھا جا سکتا ہے، انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدیداران خود اور انٹیلی جنس تحقیق کے ماہرین انٹیلی جنس اداروں کے اثر و رسوخ کے بارے میں بہت محتاط اور متواضع انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان تحقیقات میں ایک اہم ضمنی عنوان ''انٹیلی جنس کی ناکامی'' کے نام سے ہوتا ہے۔

چند ہفتے قبل تحقیقی صحافی ٹم وینر نے اپنی نئی کتاب ''مشن: اکیسویں صدی میں امریکی انٹیلی جنس'' شائع کی۔ وہ ۱۹۸۸ء سے انٹیلی جنس کے شعبے میں تخصصی کام کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں ان کی کتاب ''راکھ کا ورثہ'' نے امریکہ کا ''نیشنل بک ایوارڈ'' جیتا تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے امریکی مرکزی انٹیلی جنس ایجنسی (CIA) کے ابتدائی ساٹھ سالہ دور کا جائزہ لیا تھا، جس میں انہوں نے متعدد غیر خفیہ دستاویزات اور تقریباً ۲۰۰ سابق سربراہان، افسران اور اعلیٰ عہدیداروں کے براہِ راست انٹرویوز پر انحصار کیا تھا۔

اس رپورٹ میں ہم افغانستان میں امریکی انٹیلی جنس کی اس ناکامی کا جائزہ لیں گے جس کا اسے اس ملک کی تاریخ کی طویل ترین جنگ (۲۰۰۱–۲۰۲۱ء) میں سامنا کرنا پڑا۔

امریکی انٹیلی جنس کے فرائض میں تبدیلیاں:

افغانستان میں انٹیلی جنس کی ناکامی کی تفصیلات میں جانے سے پہلے رچرڈ ہیلمز کی بات سنتے ہیں، جو امریکی مرکزی انٹیلی جنس ایجنسی (CIA) کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ وہ اس ادارے میں مسلسل اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لنڈن جانسن اور رچرڈ نکسن کے صدارتی ادوار میں سات سال تک اس ادارے کے سربراہ رہے۔ بعد میں انہیں عہدے سے ہٹادیا گیا، کیونکہ انہوں نے "واٹر گیٹ" اسکینڈل کو چھپانے کی مخالفت کی تھی۔ (واٹر گیٹ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں رچرڈ نکسن کے دور میں پیش آیا۔ نکسن نے وائٹ ہاؤس میں آواز ریکارڈ کرنے والے آلات نصب کر رکھے تھے، جنہیں بالآخر انٹیلی جنس اداروں نے دریافت کرلیا اور یہ نکسن کے لیے ایک شرمناک معاملہ بن گیا۔ اسی معاملے کے افشا ہونے کے بعد نکسن نے صدارت سے استعفا دے دیا۔)

ہیلمز CIA کے قیام کا مقصد یوں بیان کرتے ہیں:

«شروع میں، یعنی ۱۹۴۷ء میں، ہمارا کام یہ تھا کہ دنیا کو عمومی طور پر اور دشمن کو خصوصی طور پر جانیں اور مستقبل میں پرل ہاربر جیسے حملے کو روکیں (یہ ۱۹۴۱ء میں جاپان کا امریکی ہوائی اڈے پر اچانک حملہ تھا، جس میں ۲۴۰۰ امریکی مارے گئے۔ اس وقت کے صدر فرینکلن نے اس دن کو شرمناک قرار دیا تھا)۔

ذہنیت یہ تھی کہ ایسا ادارہ بنایا جائے جو تجزیہ کاروں کو دور سے ہر چیز کو دیکھنے کی صلاحیت دے، خواہ وہ کتنی ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو۔ جاسوس کریملن کے راز دریافت کرتے، علمی تجزیہ کاران کا تجزیہ کرتے اور منتظمین اپنی رپورٹس امریکی صدر کو دیتے۔ ابتدا میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مخالف فریق کے منصوبوں، ارادوں اور صلاحیتوں کے بارے میں ہماری معلومات یا تو بالکل نہیں تھیں یا نہایت معمولی تھیں۔ اگر ہمیں کسی ٹیلی فون کی ایک دلیل یا ہوائی اڈے کا نقشہ مل جاتا تو وہ ہمارے لیے انتہائی اہم ہوتا۔ ہم دنیا کے بیشتر حصوں کے بارے میں بالکل بے خبر تھے۔

جب سرد جنگ شروع ہوئی تو CIA کا کام بدل گیا اور ۱۹۴۹ء کے اختتام تک کمیونزم کو شکست دینا بنیادی مقصد قرار پایا۔ چنانچہ دنیا کو جاننے کا کام دوسرے درجے پر چلا گیا اور اس کی جگہ خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے دنیا کو تبدیل کرنے کی پالیسی نے لے لی۔

CIA نے ایسے شعبے قائم کرنا شروع کیے، جیسے ایران میں مصدق کی حکومت کے خلاف، جو فوجی بغاوتوں کے منصوبوں پر کام کریں یا سیاسی جماعتوں، معروف شخصیات اور تاجروں کی انجمنوں کو خریدنے کے قابل ہوں، جیسا

کہ اٹلی اور یونان میں ہوا، تاکہ کمیونسٹ جماعتوں کو انتخابات میں شکست دی جاسکے۔ اسی طرح روس، پولینڈ، یوکرین، چین اور شمالی کوریا میں مخالف عناصر کو پیراشوٹ کے ذریعے داخل کیا گیا تاکہ جاسوسی اور تخریب کاری کے مشن انجام دیں۔ اس کے علاوہ CIA نے غیر ملکی رہنماؤں کے قتل کے آپریشنز میں بھی تعاون کیا، جیسے ۱۹۶۱ء میں کانگو کے وزیر اعظم پیٹریس لومومبا اور ۱۹۷۳ء میں چلی کے صدر سالوادور آلینڈے کے خلاف۔

CIA کو "خلیجِ خنزیر" کے آپریشن کی ناکامی کے باعث شدید رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس آپریشن کا مقصد مسلح کیوبن مخالفین کے ذریعے کیوبا پر حملہ کروانا تھا۔ صدر جان کینیڈی کی ہدایت پر کیوبا کے صدر فیدل کاسترو کو قتل کرنے کی کوشش بھی ناکام ہوئی، بلکہ کینیڈی خود امریکی نوجوان اوسوالڈ کے ہاتھوں قتل ہوگئے، جس کے سوویت یونین اور کیوبا کے ساتھ مشتبہ روابط تھے۔

بعد میں واٹر گیٹ اسکینڈل سامنے آیا اور نکسن نے اپنے سیاسی مخالفین کی جاسوسی کے لیے CIA کا ناجائز استعمال کیا۔ اسی وجہ سے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کانگریس نے ایک خصوصی کمیٹی قائم کی تاکہ انٹیلی جنس سرگرمیوں کی نگرانی کی جاسکے اور CIA کو اپنے اصل مقصد کی طرف واپس آنے پر مجبور کیا جائے، یعنی دنیا اور دشمن کو جاننے کا مشن۔

CIA کی صلاحیتوں کو ایک اور بڑا دھچکا اس وقت لگا جب ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے انہدام کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر میں CIA کی تجزیاتی رپورٹس میں کہا گیا تھا کہ دس سال کے اندر امریکہ فوجی طاقت اور اقتصادی ترقی کے لحاظ سے سوویت یونین سے پیچھے رہ جائے گا، لیکن اس کے برعکس ہوا۔

کمیونسٹ دشمن کے خاتمے نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں CIA کے اثر و رسوخ کو کمزور کر دیا۔ صدر کلنٹن کے دور میں اس کا بجٹ تقریباً ۶۰۰ ملین ڈالر کم کر دیا گیا، تیس سے زیادہ بیرونِ ملک مراکز بند کر دیے گئے اور تقریباً پانچ ہزار افراد ادارے سے نکل گئے۔ خفیہ آپریشنز، غیر ملکی ایجنٹوں کی بھرتی، دشمن انٹیلی جنس اداروں میں رسائی اور دہشت گردی کے نام پر نیٹ ورکس کو توڑنے کے لیے مخصوص شعبے کے اعلیٰ عہدیدار صرف ایک ہزار کے قریب رہ گئے۔ ادارے کے سربراہ جارج ٹینیٹ کے مطابق، نیویارک شہر کے دفتر میں FBI کے ایجنٹوں کی تعداد CIA کے تمام بیرونِ ملک اعلیٰ عہدیداروں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔

اسی دور کے بارے میں CIA کے نائب سربراہ (۱۹۸۹–۱۹۹۲ء) رچرڈ کیر کہتے ہیں: "سوویت یونین کا انہدام امریکی انٹیلی جنس کے لیے ایک سخت دھچکا تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔"

انٹیلی جنس افسر ڈوان کلاریج نے ۱۹۹۷ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد لکھا: ”ادارہ ایک مؤثر انٹیلی جنس ادارے کے طور پر ختم ہوچکا ہے اور صرف اسی وقت دوبارہ فعال ہوگا جب کوئی بڑا بحران پیدا ہوگا۔“

اسی طرح جارج ٹینیٹ نے ۱۹۹۸ء میں ایک خفیہ رپورٹ میں کہا تھا: ”اگر حکومت کے انٹیلی جنس معلومات جمع کرنے، ان کا تجزیہ کرنے اور انہیں تیار کرنے کے طریقے میں گہری اور جامع تبدیلی نہ لائی گئی تو امریکہ بہت جلد ایک بڑی، بنیادی اور تباہ کن انٹیلی جنس ناکامی سے دوچار ہوگا۔“

عراق بطور اولین ہدف:

ٹم وینر لکھتے ہیں کہ ۱۹۹۸ء میں القاعدہ کی جانب سے کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملوں نے ظاہر کیا کہ یہ تنظیم اپنے مرکز افغانستان سے تین ہزار میل دور ایک ہی وقت میں دو اہداف کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ اسی واقعے نے CIA کو مجبور کیا کہ وہ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور بلقان کے مختلف علاقوں میں دھماکوں کے مشتبہ افراد کا تعاقب شروع کرے۔

۱۹۹۹ء میں CIA نے پینٹاگون کو غلط معلومات فراہم کیں اور سربیا کے دارالحکومت بلغراد میں چینی سفارت خانے کو سرب فوجی ذخیرے کے بجائے بمباری کا نشانہ بنایا گیا، جس میں تین افراد ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

اس کے بعد صدر کلنٹن نے CIA کی صلاحیتوں اور اس کے تجزیوں پر اعتماد کھو دیا اور افغانستان میں القاعدہ کی قیادت کو نشانہ بنانے کا فیصلہ ایک بار پھر مؤخر کر دیا گیا۔ انہوں نے افغانستان پر مزید حملوں کی اجازت نہیں دی۔

جب بش ۲۰۰۱ء کے آغاز میں اقتدار میں آیا تو وزیرِ دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ نے فخر سے کہا:

”کئی دہائیوں کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ملک کو کوئی بڑا تزویراتی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ ہمیں اس خوف کے ساتھ ہر صبح اٹھنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی بڑا واقعہ پیش آنے والا ہے۔“

جب CIA کا سربراہ جارج ٹینیٹ افغانستان میں القاعدہ کی فائل نئی انتظامیہ کے سامنے پیش کر رہا تھا تو قومی سلامتی کونسل کی جانب سے کوئی سنجیدہ ردِعمل سامنے نہیں آیا، کیونکہ بش انتظامیہ کے پاس افغانستان کے بارے میں کوئی پالیسی نہیں تھی۔

ادارے کی پرانی شخصیات، جیسے نائب صدر ڈک چینی اور وزیرِ دفاع رمزفیلڈ، CIA کے ارادوں پر شک کرتے تھے۔ انہیں نکسن کے دور سے تجربہ حاصل تھا اور انہیں خوف تھا کہ کہیں یہ ادارہ لبرل افراد کی ایسی سازش تو

نہیں چلا رہا جس کا مقصد ریپبلکن حکومت کی بنیاد کو کمزور کرنا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ القاعدہ کے خطرے کی بات شاید ایک ایسا دھوکہ ہو جو وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون کو اصل اور فوری مسائل سے ہٹا کر ثانوی اور بعد کے مسائل میں الجھا دے۔

دوسری طرف عراق کی فائل بش کے اقتدار سنبھالنے کے آغاز ہی سے قومی سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں ہفتے میں دو یا تین مرتبہ زیرِ بحث آتی تھی۔ دلیل یہ تھی کہ صدام حسین کی رجیم کا تختہ الٹنے سے واشنگٹن عرب دنیا پر غالب آجائے گا، اسرائیل کی سکیورٹی مضبوط ہوگی اور خطے کے دیگر ڈکٹیٹر بھی ڈومینو افیکٹ کی طرح ایک کے بعد ایک گر جائیں گے۔ (ڈومینو پتھروں کے جڑے ہوئے ٹکڑوں کا ایک کھیل ہے، جس میں ایک پتھر کو نشانہ بنایا جائے تو اس کے ساتھ جڑے ہوئے پتھر مسلسل گرتے چلے جاتے ہیں۔)

اس منصوبے کی تشہیر میں اس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم بینجمن نیتن یاہو نے اہم کردار ادا کیا۔ ۴ اگست ۲۰۰۱ء کو CIA کو ہدایت دی گئی کہ صدام حسین کی رجیم کا تختہ الٹنے کے لیے خفیہ آپریشن کا تفصیلی منصوبہ تیار کیا جائے۔

ادارے کے ایک قریبی اڈے، جو عراق کے ایک ہمسایہ ملک میں واقع تھا، نے ایسا منصوبہ بنایا کہ صدام کو یہ تاثر دیا جائے کہ گویا بغداد میں ایک داخلی اپوزیشن پیدا ہوگئی ہے اور اس کے قریبی حلقے کے ارکان اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ صدام کو اپنے وفاداروں کو قتل کرنے پر مجبور کیا جائے تاکہ ایک خیالی بغاوت کو روکا جاسکے اور اس طرح اقتدار کے ڈھانچے پر اس کی گرفت کمزور ہو جائے۔ اس کے بعد جنوبی اور شمالی عراق میں مخالف گروہوں کی سرگرمیوں کے ذریعے رژیم کا تختہ الٹ دیا جاتا۔

ستمبر کے واقعات اور افغانستان کا جال

۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کو قومی سلامتی کونسل نے القاعدہ کی فائل پر بحث کی، کیونکہ مسلسل ایسی اطلاعات دی جا رہی تھیں کہ ایک بڑا حملہ قریب ہے، لیکن اس کا مقام اور ہدف واضح نہیں تھا۔ ایک ہفتے بعد حملے ہوئے جن میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاورز اور واشنگٹن میں وزارتِ دفاع (پینٹاگون) کو نشانہ بنایا گیا۔

حملے کے چند گھنٹے بعد وزیرِ دفاع رمزفیلڈ نے مطالبہ کیا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا عراق اور ان حملوں کے درمیان انٹیلی جنس معلومات کی بنیاد پر کوئی تعلق ہے یا نہیں۔

اگلے روز برطانیہ کی غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسی (MI6) کا سربراہ رچرڈ ڈیئرلوف اپنے چند نائبین کے ساتھ ایک خصوصی طیارے میں لندن سے واشنگٹن پہنچا۔ اس نے اپنے امریکی ہم منصبوں سے کہا:

"ہمیں افغانستان پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور کسی اور چیز پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔"
اس کا مقصد بش انتظامیہ کو عراق پر حملے سے باز رکھنا تھا۔
۱۵ ستمبر کو کیمپ ڈیوڈ کی جنگی کونسل نے حملوں کے جواب کے طور پر CIA کا منصوبہ منظور کر لیا۔ اس منصوبے میں کہا گیا تھا کہ القاعدہ کے ارکان اور اس سے متعلق افراد کے خلاف ۹۲ ممالک میں کارروائیاں کی جائیں گی۔
اس کے علاوہ امریکہ کی جانب سے "دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ" کے عنوان کے تحت غیر ملکی اور دوست انٹیلی جنس اداروں کو بڑے پیمانے پر مالی امداد دی جائے گی۔ اس سمجھوتے کے مطابق امریکی پیسے، ہتھیار اور نگرانی کے آلات فراہم کریں گے، جبکہ دوست ادارے گھروں پر چھاپے ماریں گے اور دہشت گردی کے الزام میں مشتبہ افراد کو گرفتار یا قتل کریں گے۔
افغانستان کے حوالے سے منصوبہ یہ تھا کہ شمالی اتحاد کے مخالف رہنماؤں کو پیسے اور مدد دی جائے تاکہ وہ شیخ اسامہ اور ان کے نیٹ ورک کو ختم کریں اور طالبان حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ یوں CIA ایک بار پھر خفیہ آپریشنز کی طرف مڑ گئی اور محض جاسوسی اور تجزیے کے بجائے براہِ راست مداخلت کا راستہ اختیار کیا۔
اس ادارے کی جانب سے عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کے بارے میں جعلی رپورٹس امریکہ کے لیے عراق پر حملہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کا سبب بنیں۔
اس وقت وزیرِ خارجہ نے اصرار کیا کہ پہلے سفارت کاری کے ذریعے طالبان کو شیخ اسامہ حوالے کرنے پر قائل کیا جائے، پھر جنگ شروع کی جائے، لیکن صدر بش نے کہا:
"یہ واضح ہونا چاہیے، ہم سفارت کاری پر کوئی توجہ نہیں دیں گے، ہم جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔"
جب برطانویوں نے امریکہ کا منصوبہ دیکھا تو MI6 کے انسدادِ دہشت گردی شعبے کے سربراہ مارک ایلن نے پوچھا:
"جب ہم افغانستان کی جنگ ختم کر لیں گے اور القاعدہ کے ارکان پوری اسلامی دنیا میں پھیل جائیں گے، تو پھر ہم کیا کریں گے؟"
ٹم وینر کے مطابق امریکیوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
شمالی اتحاد کی افواج نے، جنہیں چند سو امریکی انٹیلی جنس اہلکاروں اور خصوصی دستوں کی مدد حاصل تھی، طالبان حکومت کا تختہ الٹ دیا، لیکن پھر ایک بڑا سوال پیدا ہوا: اس کے بعد کیا ہوگا؟
وینر اپنی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین جنرل رچرڈ مائرز نے کہا:

"افغانستان میں مجھے جو مشن دیا گیا تھا وہ یہ تھا: داخل ہونا، القاعدہ کا تعاقب کرنا اور پھر افغانستان سے نکل جانا۔۔۔ صدر بش نے کہا تھا کہ ہم وہاں حکومت بنانے کے لیے نہیں گئے۔"

وزارتِ خارجہ کے پالیسی پلاننگ ڈائریکٹر رچرڈ ہاس نے بھی کہا:

"ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ طالبان کے خاتمے کے بعد ہم کیا کریں گے۔"

جب CIA کی جانب سے مقرر کیے گئے حامد کرزئی نے طالبان کے ساتھ امن اور مفاہمت کے معاہدے پر دستخط کرنے کی تجویز پیش کی تو وزیرِ دفاع رمزفیلڈ نے مخالفت کی۔ دلیل یہ تھی کہ امریکہ امن نہیں چاہتا بلکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ چاہتا ہے۔

جنگ تقریباً ۲۰ سال تک جاری رہی اور بالآخر ۲۰۲۰ء میں دوحہ میں طالبان کے ساتھ امن معاہدہ طے پایا، طالبان دوبارہ اقتدار میں آگئے اور امریکی افواج کے انتشار زدہ انخلا نے دنیا کی آنکھوں کے سامنے وہ مناظر دوبارہ پیش کر دیے جو ایک زمانے میں ویتنام کے دارالحکومت سائگون سے انخلا کے دوران دیکھے گئے تھے۔

ناکام انٹیلی جنس:

انخلا کے بعد امریکہ کے سابق عہدیداروں نے اعلیٰ سطح پر ناکامی کی بات کی اور اس بڑی ذمہ داری کا ایک حصہ CIA پر عائد کیا۔

بش کی دوسری مدت (۲۰۰۵–۲۰۰۹ء) کے سابق قومی سلامتی مشیر اسٹیفن ہیڈلی نے کہا کہ نئی افغان حکومت کی بدعنوانی طالبان کے ارکان کو اپنی طرف راغب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ وہ نیز اس بدعنوانی کے منبع کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"بدعنوانی کی اصل وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے CIA افغانستان میں اپنے معاملات چلاتی تھی۔ وہ ڈالر کے سو سو نوٹوں کے ڈھیروں میں لین دین کرتے تھے۔ وہ ڈالر کی بوریاں تقسیم کرنے، نئی جیپوں اور سیٹلائٹ کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے تیز رابطے میں بہت ماہر تھے۔۔۔ لیکن جب بات حقیقت تک پہنچتی اور یہ سوال آتا کہ کیا ہو رہا ہے اور مستقبل میں کیا چاہتے ہیں، تو نتیجہ صفر تھا۔"

رابرٹ گیٹس نے ۱۹۶۶ء میں CIA کے تجزیہ کار کی حیثیت سے کام شروع کیا، پھر ۱۹۹۱–۱۹۹۳ء کے دوران ادارے کا سربراہ رہا اور ۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۱ء تک وزیرِ دفاع رہا۔ اسے ادارے کے سب سے پیشہ ور سربراہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات میں ہمیں القاعدہ کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے ایسے کام کیے گئے، جیسے تشدد پر مبنی تفتیش، کیونکہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اگر ہمارے پاس ایک پختہ ڈیٹا بیس ہوتا اور ہمیں مکمل طور پر معلوم ہوتا کہ القاعدہ کیا ہے، اس کی صلاحیتیں کیا ہیں وغیرہ، تو شاید بہت سے اقدامات ضروری نہ ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے گروہ نے اچانک آلیا جس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں۔"

ہیڈلی اور گیٹس کے جائزے ظاہر کرتے ہیں کہ CIA اپنے بنیادی فرض میں ناکام رہی: دشمن کو جاننا۔ سابق سربراہ ہیلمز کی اصطلاح میں یہ ناکامی ایسی تھی جیسے CIA ایک اور پرل ہاربر کو روکنے کی صلاحیت کھو چکی ہو۔

انٹیلی جنس کے کام کا جوہر صرف افراد کا تعاقب کرنے یا دشمن تنظیموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے تک محدود نہیں، بلکہ اس کا بنیادی مقصد فیصلہ سازوں کو ایسی معلومات اور تجزیے فراہم کرنا ہے جو پورے منظر نامے کی مکمل تصویر پیش کریں، خطرات کا درست اندازہ لگائیں اور دستیاب مواقع کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ اسے تزویراتی انٹیلی جنس کہا جاتا ہے، اور انہی بنیادوں پر بڑے فیصلے کیے جاتے ہیں اور طویل مدتی پالیسیاں تشکیل دی جاتی ہیں۔

خصوصی آپریشنز، جیسے قتل، خاتمہ اور گرفتاری، تکنیکی انٹیلی جنس کا حصہ ہیں۔ اگرچہ یہ بعض اوقات نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے ہیں، لیکن جنگیں جیتنے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔

امریکی انٹیلی جنس نے ہزاروں تکنیکی آپریشنز کیے، طالبان کے دوسرے سربراہ ملا اختر منصور کو شہید کیا، طالبان کے ہزاروں ارکان کو گرفتار کیا اور القاعدہ کے افراد کا ایک کے بعد ایک تعاقب کیا۔ لیکن ان ٹکڑوں میں بٹی ہوئی کامیابیوں نے بڑی شکست کو نہیں روکا۔ چار سال قبل افغانستان میں وہ تمام کچھ جو بیس سال میں تعمیر کیا گیا تھا، اگست ۲۰۲۱ء کے چند دنوں میں منہدم ہو گیا۔

امریکہ نے ان بیس برسوں میں افغانستان میں سینکڑوں ارب ڈالر خرچ کیے، لیکن اس کی انٹیلی جنس ایسی معلومات پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکی جو افغان معاشرے کے پیچیدہ ڈھانچے کو سمجھ سکے یا جنگ کے مستقبل کی پیش گوئی کر سکے۔

افغانستان میں ناکامی انٹیلی جنس کی طویل تاریخ میں ایک اور بڑا تزویراتی باب شامل کرتی ہے اور گہرے سوالات اٹھاتی ہے: کیا کوئی بڑی عالمی طاقت اکیسویں صدی میں اپنی سخت طاقت کو میدانِ عمل کی کامیابیوں میں تبدیل کر سکتی ہے یا نہیں؟

اُمتِ مسلمہ کی عزت و سربلندی علماء کے قلم
کی سیاہی اور شہداء کے لہو کے رنگ
سے وابستہ ہے۔

شہید عبد اللہ عزام رحمہ اللہ

ALMERSAAD

Almirsad_Urdu Almirsad_Urdu almirsaadur.com